مریم جہانگیر

ڈر

"تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟"
"جیسے زندگی کو موت ڈھونڈتی ہے۔"
"تم کہنا چاہتے ہو کہ تم میری موت ہو؟"
"نہیں تم میری زندگی ہو۔"
"اگر میں تمہاری زندگی ہوں تو اس سے پہلے تم کیا کر رہے تھے؟"
"بھٹک رہا تھا تمہاری تلاش میں۔۔۔"
"اب بھی بھٹکتے رہو گے؟"
"نہیں اب بہکوں گا۔"
"تم اب حدود پھلانگ رہے ہو۔"
"نہیں میں اپنی حدود میں ہوں۔۔۔ تم میرے دائرے سے باہر نکلنا چاہ رہی ہو۔"
"تمہارے دائرے سے نکل کر میں کہاں جاؤں گی؟"
"جہاں بھی جاؤں گی لوٹ کر یہیں آؤ گی۔"
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"
"یہ میرا یقین ہے۔"
"اتنا یقین کیوں؟"
"محبت یقین کرنا سکھا دیتی ہے۔"
"لیکن میں تو تم سے محبت نہیں کرتی۔"
"میں تو کرتا ہوں نا۔۔۔ یہ تو صرف تمہاری زبان کہہ رہی ہے کہ تم محبت نہیں کرتی۔"
"بولتی تو زبان ہی ہے۔۔۔ زبان سے ہی اظہار ہوتا ہے۔"

"تمہاری آنکھوں سے زیادہ حسین گفتگو کوئی نہیں کر سکتا۔"
"تم سے بہتر باتیں کوئی نہیں بنا سکتا۔"
"مجھے لگا تھا شاید مجھے آج باتیں نہ بنانی پڑیں۔"
"تمہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ تم باتیں بناتے ہو؟"
"ہر شخص بناتا ہے۔"
"ہر شخص تسلیم نہیں کرتا۔"
"ہر شخص میرے مقام پہ نہیں ہے۔ آج مجھے کوئی ڈر نہیں ہے، میری زندگی میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔"
"اور اگر زندگی ہاتھ سے نکل گئی؟"
"مجھے سجدوں پہ یقین ہے۔۔۔ میری دعائیں اس ایک کے سامنے ہوتی ہیں جو نیتوں سے واقف ہے۔ وہ میرے بہت کے بدلے مجھے کم از کم اس معاملے میں اب مزید نہیں آزمائے گا۔۔۔ اور اگر آزما بھی لیا تو بھی آخر میں نوازے گا۔"
"ہاں۔۔۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ خالی ہاتھ تھی، کسی انگلی میں چاندی کا چھلا اور کلائی میں کانچ کی چوڑی بھی نہیں تھی۔ گود میں اس کی کل کائنات تھی۔ اس نے اپنے حلق پہ ہاتھ پھیرا۔ حلق بھی ہاتھ کی طرح خشک تھا۔ اوپر دیکھا تو سورج تیوریاں چڑھائے چودہ طبق روشن کرنے پر تلا ہوا تھا۔

مکمل ناول

مریم جہانگیر

ڈر

"تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟"
"جیسے زندگی کو موت ڈھونڈتی ہے۔"
"تم کہنا چاہتے ہو کہ تم میری موت ہو؟"
"نہیں تم میری زندگی ہو۔"
"اگر میں تمہاری زندگی ہوں تو اس سے پہلے تم کیا کر رہے تھے؟"
"بھٹک رہا تھا تمہاری تلاش میں۔۔۔"
"اب بھی بھٹکتے رہو گے؟"
"نہیں اب بہکوں گا۔"
"تم اب حدود پھلانگ رہے ہو۔"
"نہیں میں اپنی حدود میں ہوں۔۔۔ تم میرے دائرے سے باہر نکلنا چاہ رہی ہو۔"
"تمہارے دائرے سے نکل کر میں کہاں جاؤں گی؟"
"جہاں بھی جاؤں گی لوٹ کر یہیں آؤ گی۔"
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"
"یہ میرا یقین ہے۔"
"اتنا یقین کیوں؟"
"محبت یقین کرنا سکھا دیتی ہے۔"
"لیکن میں تو تم سے محبت نہیں کرتی۔"
"میں تو کرتا ہوں نا۔۔۔ یہ تو صرف تمہاری زبان کہہ رہی ہے کہ تم محبت نہیں کرتی۔"
"بولتی تو زبان ہی ہے۔۔۔ زبان سے ہی اظہار ہوتا ہے۔"

"تمہاری آنکھوں سے زیادہ حسین گفتگو کوئی نہیں کر سکتا۔"
"تم سے بہتر باتیں کوئی نہیں بنا سکتا۔"
"مجھے لگا تھا شاید مجھے آج باتیں نہ بنانی پڑیں۔"
"تمہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ تم باتیں بناتے ہو؟"
"ہر شخص بناتا ہے۔"
"ہر شخص تسلیم نہیں کرتا۔"
"ہر شخص میرے مقام پہ نہیں ہے۔ آج مجھے کوئی ڈر نہیں ہے، میری زندگی میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔"
"اور اگر زندگی ہاتھ سے نکل گئی؟"
"مجھے سجدوں پہ یقین ہے۔۔۔ میری دعائیں اس ایک کے سامنے ہوتی ہیں جو نیتوں سے واقف ہے۔ وہ میرے بہت کے بدلے مجھے کم از کم اس معاملے میں اب مزید نہیں آزمائے گا۔۔۔ اور اگر آزما بھی لیا تو بھی آخر میں نوازے گا۔"
"ہاں۔۔۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ خالی ہاتھ تھی، کسی انگلی میں چاندی کا چھلا اور کلائی میں کانچ کی چوڑی بھی نہیں تھی۔ گود میں اس کی کل کائنات تھی۔ اس نے اپنے حلق پہ ہاتھ پھیرا۔ حلق بھی ہاتھ کی طرح خشک تھا۔ اوپر دیکھا تو سورج سوا نیزے پہ آئے جودہ طبق روشن کرنے پر تلا ہوا تھا۔

نیچے دیکھا تو زمین تندور کی طرح دہک رہی تھی۔ پلاسٹک کی چپل زمین کی گرمائش کو پیروں تک پہنچنے سے روکنے میں یکسر ناکام تھی۔

اللہ نے اسے کبھی اتنی بڑی آزمائش نہ دکھائی تھی، لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھی۔ اسے بھروسا تھا کہ اللہ نے اسے اس دنیا میں تنہا ہونے کے باوجود ہمیشہ سہارا دیا۔ سہارے کے لیے مختلف وسیلے بھیجے۔ اس دفعہ آن پڑنے والی آزمائش نے اسے صحیح معنوں میں جھنجوڑ کر رکھ دیا، لیکن اللہ پر ایسا کامل یقین تھا کہ نہ کبھی ٹھوکر کھانے دیتا اور نہ کبھی گرنے دیتا۔ سامنے نظر اٹھا کر دیکھا تو ساری دنیا گرم لگی اور سنسان۔۔۔ دور، دور تک کوئی ذی روح نہ تھا۔ اسے پھر وسیلہ چاہیے تھا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ پھر اپنی زرد سی چادر کو مزید سختی سے اپنے گرد لپیٹ لیا۔ بعض اوقات تنہا ہونا بہت سے ڈر جگا دیتا ہے۔ گرمیوں کی دوپہریں ویسے بھی کسی خوف ناک دیو کی طرح گلی کوچوں کی ساری رونقیں نگل لیتی ہیں۔ پیاس سے اب اگلا قدم رکھنا محال تھا ہاتھ میں اٹھائے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے چونک کر اپنی ننھی جان کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیم بے ہوشی کے رنگ لیے پلکوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے ہلکان تھیں۔ چہرے پہ پیاس کی داستان رقم تھی۔ نظر دوبارہ اٹھی۔

اس نے ناتواں وجود کو سینے سے لگایا اور گڑ گھائی کہنیوں کا درد آنکھوں سے سیال کی مانند نکل آیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے مسجد تھی۔ کچھ عمارتوں اور کچھ لوگوں میں کتنی کشش ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان کی گھنی چھاؤں جسم سے ساری تھکاوٹ کھینچ نکالے گی۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور مسجد کے سامنے چلی گئی۔

"بی بی کون ہو؟" وہ آدمی مسجد کی سیڑھیوں پر اسے دیکھ کر پہلی سیڑھی پہ ہی رک گیا۔ جواباً اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس ایک نظر میں اتنی فریاد تھی کہ کھڑا ہوا شخص کانپ کر رہ گیا۔ "میرے ساتھ چلو!" وہ بھی کسی ٹرانس میں گرفتار ہوئی۔ انسانوں کے تعلق کا ان لہجوں سے بہت تعلق ہے جو نظر نہیں آتیں۔ جو آنکھوں سے بولتی ہیں اور آنکھوں کی ہی سمجھتی ہیں۔ اس کی آنکھوں نے ان آنکھوں کی کپکپی پڑھ لی، وہ باول ناخواستہ اٹھی اور اس جھکی نظر والے شخص کے پیچھے چلتی مسجد سے ملحقہ گھر میں داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"زارا اٹھ جاؤ!" ثمینہ کی ایک آواز لگانے کی دیر تھی، زارا بستر سے ایسے اٹھی جیسے سوئی ہی نہیں تھی۔ منہ، ہاتھ دھویا اور ناشتے کے نام پر بچا ہوا پراٹھا۔ ایسے کھانے لگی جیسے دنیا میں اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ آدھا پراٹھا اور دو نوالے الگ سے تھے۔ اس نے خاموشی سے نگل لیے۔

"پھر کیا سوچا ہے؟ اسکول جاؤ گی؟" ثمینہ نے آس بھری نظروں سے دیکھا۔

"آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت کیوں رہتی ہے؟ آپ جانتی ہیں کہ جیسا آپ نے کہہ دیا ہے میں نے ویسا ہی کرنا ہے۔ میرا دائرہ بھی آپ اور میرا محور بھی آپ ہی ہیں۔ آپ کے کہے سے روگردانی کر سکتی ہوں، نہ آپ کی قائم شدہ حدود سے تجاوز کر سکتی ہوں۔" زارا نے برتن میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ثمینہ کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ زارا نے دیوار پر لگی اکلوتی آرائش اور ضرورت کی طرف دیکھا۔ سات بج رہے تھے۔ ماں کی کالی چادر اٹھائی اور اپنی متاع کل سے باہر نکل آئی۔ ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں سے اتری تو ماربل کا فرش منتظر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زمانہ قدیم سے عصر حاضر میں آگئی ہو۔ اس نے ایک پل کو فرق جانچا۔ اوپر کے اکلوتے کمرے میں کیا تھا؟ زندگی گزارنے کا سامان۔ نیچے کے پورشن میں کیا تھا؟ زندگی جینے کے لیے آسائشیں۔۔۔ دھیمے دھیمے قدم بڑھاتے اسے ڈر تھا کہ اگر کوئی اٹھ گیا تو اس کی ماں کی خواہش کو اپنے پیروں تلے روند دے گا۔ تمام تر احتیاط [illegible] آواز آئی۔

"اری او لڑکی۔۔۔ کام لے کر آنا۔۔۔ ہم کب تک تمہارا بوجھ اٹھائیں گے۔" اس آواز کو وہ ہزاروں میں پہچانتی تھی اور کبھی سننا نہ چاہتی تھی۔ لیکن اتنا کم از کم واضح ہو گیا کہ اس کے گھر سے نکلنے میں شاہوں کی مرضی شامل ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا دل نہ تھا اور اگر آگے چلی جاتی تو شاہوں کے سامنے گستاخ بنتی۔ اس نے منہ موڑے موڑے ہی سر اثبات میں ہلایا اور دہلیز عبور کر گئی۔

گھر سے نکلتے ہی ایک سانس جسم کے پنجرے سے آزاد ہوا۔ اس گھر میں ایک ایک سانس بھاری تھی۔ ہر ایک نوالہ بوجھ تھا اور زندگی سہمی ہوئی تھی۔ زارا کا دل چاہتا کہ اللہ سے شکوہ کرے کہ اللہ! تو نے اتنے لوگوں کو نارمل زندگی دی، نارمل اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا دیا ہے۔ اے اللہ مجھے بھی دے دیتا ایک چھوٹا سا گھر۔۔۔ جس میں میرا باپ ہوتا، زندہ ہوتا، میرے ساتھ ہوتا، چپڑی روٹی نہ کھلاتا، بھوکا سلا دیتا، لیکن میں اس سے حق سے مانگتی۔۔۔ چاہے سخت مزاج ہوتا، میری ماں پہ مار پیٹ کرلیتا، لیکن کبھی سال میں ایک دفعہ مسکرا کر دیکھ لیتا تو اس کی تھکاوٹ دور ہو جاتی۔۔۔ اتنے لوگوں کے سر پر باپ کا سایہ ہے۔۔۔ اگر ایک میرے سر پر بھی باقی رہتا تو کیا تھا؟ تیرے خزانے پہ تو کوئی اثر نہ پڑتا۔" یہ سارے شکوے اس کے اندر اٹھتے اور لبوں پر آنے سے پہلے دم توڑ دیتے۔ وجہ ڈر تھا۔

اس کی زندگی کی واحد وجہ اس کی ماں تھی۔ ماں جو پیار کرتی تھی۔ جو پوری دنیا میں واحد ہستی تھی کہ اس کے ان کہے درد جان لیتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے اللہ سے شکوہ کیا تو اللہ خفا ہو جائے گا اور اس کی ماں کو بھی چھین لے گا۔ اسی ڈر کی وجہ سے وہ خاموش تھی۔ اسے کیا پتا وہ ذات ان کہے ڈر بھی پہچان جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

زارا نے برائٹ فیوچر اسکول سے ہی میٹرک کیا تھا اور آج پورے ساڑھے چار سال بعد یہاں واپس آئی تھی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں بالیاں بے فکری کے دن جی رہی تھیں۔ جون کا مہینہ تھا۔ بی ایس سی کے امتحانات ختم ہوئے یہی کوئی تین دن گزرے تھے اور ماں نے اٹھا بھیجا تھا۔

"سونے کے بجائے اپنے ہی اسکول جا کر پڑھا لو۔ جو وقت گھر میں گزرے گا اس میں نیچے سے کوسنے تو ملتے رہیں گے۔ پیسے نہیں ملیں گے۔ پیسے گھر کے باہر سے ہی مل سکتے ہیں۔ دکان کی ٹوٹی ہوئی چھت کی مرمت کے لیے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔" وہ دکان زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے کتنی ضروری تھی۔ زارا جانتی تھی! اسی لیے اسکول میں تو آگئی تھی، لیکن انگلیاں مروڑنے پہ قابو پانا مشکل تھا۔ اس کی ناتجربہ کاری اس کے چہرے کی معصومیت سے ٹپک رہی تھی۔ اسما نے اضطراب کی شعاعوں کو اس کے وجود سے نکل کر کمرے میں رقص کرتے دیکھا تو گول چہرے اور گہری آنکھوں والی لڑکی کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

اسما اس چھوٹے سے اسکول کے مالک کی بیٹی تھی اور شادی کے بعد بھی اس ادارے کو سنبھالے ہوئے

السلام علیکم

ہمیں اپنے بلاگز (ویب سائیٹ) FAMOUS URDU NOVELS, BOOKS BANK

PRIME URDU NOVELS, FREE URDU DIGEST, READING CORNER

کے لئے ناول رائیٹرز کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم،

آرٹیکل، شاعری پوسٹ کروانا چاہیں تو ہم سے رابطہ کریں۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔

آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کے لئے انباکس میں رابطہ

کریں یا ای میل کریں یا ہمارے گروپ اور پیج پر رابطہ کر سکتے ہیں۔ یا واٹس ایپ پر بھی کانٹیکٹ کر سکتے ہیں۔

Wats app No :- 03335586927

Email address :- aatish2kx@gmail.com

Facebook ID :- www.facebook.com/aatish2k11

Facebook Group :- FAMOUS URDU NOVELS AND DIGEST

SEARCH AND REQUEST FOR NOVELS, NOVELS DISCUESSION

تھیں۔ ثمینہ کو ان کا ہمیشہ ہی بڑا آسرا رہا۔ دو چار جوڑے سی دیتی تو زارا کی فیس نہ دینی پڑتی۔ جب پانچ چھ سوٹ سیتی تو اسما بند مٹھی میں کچھ پیسے تھما دیتیں۔ گھر کا تھوڑا بہت خرچ تو چل ہی جاتا۔

زارا نے بہت نیچی آواز میں اپنا مدعا سامنے رکھا۔ پیسا انسان کو دنیا میں کتنے رنگ دکھاتا ہے۔ انسان کو نیچے لے جاتا ہے۔ اتنا نیچے کہ انسان جتنا بھی چیخ کر بولے' اس کی آواز اندر گھٹ جاتی ہے۔ جو بھی تھا اور جیسے بھی تھا۔ اس نے کبھی مدد نہیں مانگی تھی۔ کبھی فیس معافی کی درخواست نہیں دی تھی۔ معاشی حالات کمزور ہونے کے باوجود کبھی فیس جمع کروانے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ اسما مسکرائیں۔

''آج کل کے دور میں مانگنے والے ہیں۔ شکر ہے آپ نے مدد نہیں مانگی۔ آپ نے موقع مانگا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے آپ کو محنت کرنے کا راستہ دکھایا ہے۔ اگر آپ محنت کرنے کے بجائے مدد مانگنے آتیں تو شاید یہ پہلی اور آخری مدد ہوتی۔'' زارا نے ممنون نظروں سے اسما کو دیکھا۔ اس اسکول میں اس نے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ وہ اس اسکول میں کبھی پڑھانے جائے گی' یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اسما نے اگلے دن سے زارا کو اسکول پڑھانے کی نوید دی اور وہ یہ جان فزا خبر اپنے پلو سے باندھ کر گھر لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

اس شخص نے اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ بیک وقت ڈری ہوئی تھی اور مطمئن بھی تھی۔ اسے خود سے زیادہ یقین اللہ کی ذات پہ تھا۔ وہ ڈرتی' جھجکتی اس کے پیچھے چلتی آئی۔

''یہاں بیٹھ جائیں!'' اس شخص نے امرود کے درخت کے سائے میں بچھے تخت کی طرف اشارہ کیا اور سامنے ایک ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ وہ وہاں پہ ساکت بیٹھی رہی۔ بان کی چارپائی پہ پتوں سے چھن کر آتی دھوپ ٹھنڈی سی لگی۔ اب سورج سے براہ راست مقابلہ نہیں تھا۔ سامنے مٹی کا گھڑا پڑا تھا۔ دل چاہا اٹھ کر اپنی بیٹی کی پیاس بجھا لے' لیکن اس کے پاس اجازت لے کر پانی پینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ شخص واپس آیا۔ اس عاجز سے بندے کا نام رحیم تھا اور یہ نام اپنے پورے معانی اور مطالب کے ساتھ اس کی شخصیت پہ حاوی تھا۔ اس کی آدھی سیاہ' آدھی سفید داڑھی میں انکساری اور متانت جھلک رہی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے مرد اور عورت کے حال حلیے سے لگ رہا تھا کہ آرام میں خلل ڈالا گیا ہے۔

''بھابھی پانی پلائیں ان کو!'' اس شریف النفس نے ان کہی پیاس بھانپ لی۔ پانی کا گلاس تھما کر وہ عورت واپس رحیم کی طرف مڑی۔

''یہ ہیں کون رحیم؟'' وہ عورت جائزہ لینے پر مصر رہی۔ اس کی آنکھیں اندر تک جھانکنے کو بے تاب لگیں۔ آدھے گھنٹے میں ثمینہ نے اپنی ساری داستان سنائی۔ کہتے کہتے وہ رونے لگتی تو لفظوں کا راستہ آنسو روک لیتے۔ وہ ہچکی لیتی اور پھر سناتی۔ لفظ کچھ باہر نکل رہے تھے اور کچھ اندر ہی کہیں تھے۔ سننے والوں نے جو سنا اس کا لب لباب یہ تھا کہ شوہر فوت ہو گیا اور سسرال والوں نے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ سسرال دو شہر دور ہے۔ وہ بیٹی سمیت بس پہ سوار کر کے چلتے بنے۔ یہ بھی غنیمت کہ جان بخش دی۔

''ہائے ایسے کیسے نکال سکتے ہیں سسرال والے؟ تمہارا کوئی بڑا تو ہو گا اسے ساتھ لے جاؤ اور ان لوگوں سے بات کرو۔'' وہ عورت جو رحیم کی بھابھی تھی ہاتھ نچا کر بولی۔ انسان کی جسمانی حرکات اس کے باطن کا آئینہ ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھ اٹھا کر اپنی بات کی وقعت بڑھاتے ہیں اور کچھ لوگ ہاتھ اٹھا کر اپنی ہی وقعت گھٹا دیتے ہیں۔

''میرا کوئی اپنا نہیں ہے۔ صرف ایک تایا تھے۔ والدین کی وفات بچپن میں ہو گئی تھی۔ تایا بے اولاد تھے اور کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ تائی کی وفات چند برس پہلے ہوئی۔ ابھی پچھلی سردیوں میں تایا بھی

وت ہو گئے۔ کوئی عزیز رشتہ دار نہیں' جس سے سایہ مانگ سکوں۔ ملنے والے والے بھی ایسے موقع پہ صاف جان چھڑاتے ہیں' آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ پہ بھی بوجھ نہیں بنوں گی۔ یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' ثمینہ نے آنکھ کے کونے صاف صاف کرتے ہوئے اپنا خاندانی پس منظر بتایا اور اپنے سر پہ کھڑے لوگوں کی نظر میں تماشا نہ بننے کی سعی کی۔

''یعنی تمہارا کوئی نہیں؟ کوئی بھی نہیں؟ اب تم کہاں جاؤ گی؟ سنا ہے بڑے بازار میں خواتین کو پناہ دینے والا ادارہ ہے۔ اتنی اچھی ساکھ نہیں ہے' لیکن اب تمہیں کوئی نہ کوئی چار دیواری اور چھت تو چاہیے۔ ابھی دو گھڑی سکون لو' پھر میں کشور بیگم خود تمہیں چھوڑ کر آتی ہوں۔'' اس عورت نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے دبے لفظوں میں باہر کا راستہ دکھایا۔ ثمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ کہیں نہیں جائیں گی۔ یہ یہیں رہیں گی۔'' رحیم نے قطعی انداز میں کہا۔

''بھائی پاگل ہو گئے ہو۔۔۔ یہ پتا نہیں کون ہے اور کون نہیں اور تم اسے اپنے گھر میں کیوں رکھنا چاہ رہے ہو؟'' خاموش کھڑے مرد کی زبان کلبلائی۔

''یہ یہاں رہے گی کہاں؟ دو کمرے ہیں۔۔۔ ایک ہمارا اور ایک تمہارا!'' کشور بیگم نے اپنے شوہر کے منہ سے نکلی بات کو آگے بڑھایا۔

''سلیم میں نے کہہ دیا' یہیں رہیں گی تو یہیں رہیں گی۔'' اب رحیم کا انداز حتمی ہوا۔ وہ دونوں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ گھر رحیم کا تھا اور اس کا اندازہ رحیم کے قطعی اور حتمی انداز سے ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بات کہہ کر گھر سے باہر چلا گیا۔

ثمینہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ بے بس تھی۔ آسمان والے نے زمین والوں کے حوالے کیا تھا اور زمین والے اسے تھوڑی سی زمین دینے کے روادار نہ تھے۔ پانچ منٹ بعد جب مسجد سے ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کی صدا سنائی دی تو ڈھیروں سکون ثمینہ کے اندر اتر گیا۔ وہ وضو کے لیے اٹھی۔ اس کے لیے اسے

کسی کی اجازت درکار نہ تھی۔ فلک پہ پرندے اذان سن کر اپنے رزق کو سمیٹنے کے لیے جلدی کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

گھر میں داخل ہوئی تو خوشی اس کے ہر قدم سے جھلک رہی تھی۔ وہی بھاگ جانے کا دل 'وہی ڈر جانے والی طبیعت اور وہی چھپ جانے کی خواہش۔ اس نے تیز تیز قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھائے 'لیکن وہی قسمت.... آواز آئی۔

"رک جاؤ!" اور وہ رک گئی۔

"کام مل گیا؟" مردانہ آواز نے سختی سے پوچھا۔

"جی!" اس نے مختصر جواب دیا۔ "اس گھر سے باہر جا تو رہی ہو 'لیکن یاد رکھنا اگر اس گھر کی طرف کوئی بھی انگلی اٹھی یا کوئی بھی پتھر صحن میں آیا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" کہنے والا قطعیت سے کہہ کر برآمدے سے غائب ہو گیا۔ زارا کے لیے پہلی سیڑھی پر پیر رکھنا مشکل ہو گیا۔ پھر سے وہی ذمہ داریوں کا بوجھ 'پھر سے وہی شک کی کڑی نگاہیں اور کینہ توز لہجے....

سرکاری اسکول اتنے فاصلے پر تھا کہ وین میں آنا جانا پڑتا۔ ثمینہ وین کا خرچا کیسے برداشت کرتی۔ جتنا خرچا وین کا بنتا اس خرچے سے کم میں دو گلیاں چھوڑ کر برائٹ فیوچر میں کام بن گیا۔ وہ برائٹ فیوچر میں پہلی بار بھی اماں کے ساتھ گئی تھی۔ اول اماں کو لوگوں سے تعریف سن کر دفتر کے پردے اور نمونے کا یونیفارم سلائی کرنے کے لیے بلایا۔ بعد ازاں اسما کی خدا ترسی نے اماں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ گھر کی چھوٹی بڑی بات سن لیتی 'لیکن زارا کو میٹرک وہیں سے کروایا۔ یہ اور بات کہ کو ایجوکیشن کی وجہ سے زارا کا اپنا سانس اٹکا رہتا۔ تراشنے والے نے اسے خوب تراشا تھا۔

سنہری سی رنگت جیسے صحرا کے دمکتے ذروں پہ سورج کی روشنی چمک رہی ہو۔ تیکھے سے نقش اور بہت گہری آنکھیں 'ایک دفعہ نظر پڑ جائے تو پھر ہٹانے میں بھی دقت ہوتی۔ کچھ تو تھا اس میں یا اس کی مسکراہٹ میں کہ دل مزید دیکھنے کی خواہش کرتا۔

کالے گھنے بالوں کی صدائیں اور سیاہ آنکھیں صدیوں کی مسافتیں 'ڈری سہمی بھی کمال لگتی۔ سب سے کمال اس کی چھوٹی سی ناک میں چمکتی لونگ تھی 'اس کی روشنی کالی آنکھوں سے منعکس ہو کر دیکھنے والے کو دیوانہ کر دیتی۔ ایسا تب ہوتا جب وہ گھنی پلکیں اٹھا کر کسی کو دیکھتی۔ زیادہ تر وہ نظریں جھکا کر رکھتی اور عام سی ہی محسوس ہوتی۔ عام سی بھی اس لیے کہ اس کی معصومیت کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے فن سے ناواقف تھی۔ اپنی طلسمانہ کشش سے انجان اپنی محرومیوں کی بکل میں دنیا کی وسعتوں سے انجان وہ ڈرتی رہتی کہ کہیں کوئی بغیر موقع کے ہی موقع نکالنے کی کوشش نہ کرے اور اسے زندگی کے رنگ دکھاتا یہ واحد روزن بند نہ ہو جائے۔

احتیاط کرتے کرتے دس برس گزر گئے۔ پہلے پانچ سال ثمینہ نے خود احتیاط کی ہر کاپی۔ ہر کتاب کے آخری صفحے پہ نظر رکھی اور پھر یہی سبق گھول کر زارا کو پلا دیا۔ زارا کے طور اطوار خود بخود ماں کے پڑھائے سبق میں ڈھل گئے۔ دسویں کے بعد لڑکیوں کے کالج میں داخلہ لیا تو سکھ کا سانس لیا۔ اب پہلے جتنا ڈر نہیں رہا تھا... وہ عمل اور رد عمل سے واقف ہو چکی تھی۔ بالکل خاموش بت بن کر زندگی میں سکون آگیا۔ لہجوں کا ڈر ابھی بھی تازہ تھا اور یہ ڈر ابھی قطرہ قطرہ پھر اس کے اندر اتار گیا تھا وہ تھکے تھکے قدم اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھا تو اماں کی آواز آئی۔

"آگئی ہو؟ کوئی خیر کی خبر؟" ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جیسے اس چھو کر گزر گیا اور وہ مسکرا دی۔ ماں کو اولاد کی کچی پکی سیڑھی پر رکھے دبے قدموں کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ ماں سے زیادہ کوئی منتظر نہیں۔

"آپ کی دعائیں جب تک میرے ساتھ ہیں 'میں خیر کی خبر ہی لاؤں گی۔" زارا نے مسکرا کر ماں کو دیکھا اور کالی چادر اتار کر مسہری پر رکھی۔ ثمینہ کو لگا کہ جیسے خوشیاں دور کہیں سے اس کا پتا پوچھتی آرہی ہوں۔

☼ ☼ ☼

یہ گھر ثمینہ کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ صبح اٹھتی تو صحن میں رحیم کو دانہ دنکا پرندوں کو ڈالتے دیکھتی۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے سیڑھیوں سے اوپر ایک کمرہ بنا کر ثمینہ کو اس میں منتقل کر دیا تھا۔ ثمینہ کے لیے وہ مسیحا ثابت ہوا۔ اس اللہ کے بندے نے رہنے کو زمین دے دی تھی۔ سارا دن گھر کے کام کرتے گزر جاتا۔ کشور اور سلیم نے بھی اس صورت حال سے اتفاق کر لیا۔ انہیں مفت کی ملازمہ مل گئی تھی 'پھر اعتراض کا ہے کا۔ دن پر لگا کر اڑتے گئے۔ ثمینہ نے ایک دو بار رحیم سے بات کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہیں اس کے لیے کوئی کام ڈھونڈ دے 'لیکن رحیم نے کوئی مثبت عندیہ نہ دیا۔ ہمیشہ آدھی ادھوری بات چھوڑ کر اٹھ جاتا۔ یوں جیسے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔

ثمینہ کی عدت پوری ہوئے دوسرا روز تھا۔ کشور اور سلیم شادی پر گئے ہوئے تھے۔ ثمینہ اپنی بیٹی کو کمرے میں لٹا کر صحن دھو رہی تھی۔ دروازہ چرچر کی آواز سے کھلا۔ لکڑی ایک فطری شے ہے اور فطری چیزوں کا شور کبھی کانوں کو برا نہیں لگتا۔ رحیم کے آنے کا وقت تھا۔ ثمینہ نے فوراً پائنتی پہ رکھی اوڑھنی سے سر اور جسم ڈھانپا۔ رحیم کے قدموں میں اضطراب نمایاں تھا۔ وہ اس کے قریب یوں آیا جیسے برسوں سے مسافر ہی ہو۔ وقت بھی بے لگام گھوڑا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اس پہ سواری کر رہا ہے۔ اسے اپنی مرضی سے دوڑا رہا ہے۔ اپنی مرضی کی سمتوں میں لے جا رہا ہے۔ لیکن پھر یوں ہوتا ہے کہ یہ گھوڑا بدک جاتا ہے۔ سارے منصوبے 'تمام سمتیں کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں اور یہ بے لگام گھوڑا اپنی مرضی کے فیصلے کروا لیتا ہے۔ تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارے فیصلے تو ریت کے گھر تھے۔ سچ تو یہ بے لگام گھوڑا ہے۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" رحیم نے ہتھیلیوں پہ آئے پسینے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جی کہیں!" ثمینہ اپنے محسن کے سامنے مؤدب ہوئی۔

"میں آپ سے شادی کا خواہاں ہوں۔ مجھ سے شادی کریں گی؟" اس نے بغیر نظر ڈالے سوال کیا۔

ساری عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ وقت کے ہاتھوں میں بساط آنے پہ منہ چڑاتا نظر آیا۔

"اسی لیے روکا تھا آپ نے؟" ثمینہ طیش کھا گئی۔ اس کے الفاظ سادہ لیکن لہجہ بے حد کڑوا لگا۔

"نہیں..." مکمل یقین سے یہ ایک لفظ ادا کر کے اس کے لب مزید ملے۔ "اس دن میرے دل کو عجیب سی بے چینی تھی۔ سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت تھی۔ میں اپنے کمرے میں رکا رہا۔ باہر آیا تو مسجد کی سیڑھی پہ آپ کو بیٹھا دیکھا۔ آپ کی گود میں ننھی سی گڑیا دیکھی۔ اگر وہ آپ کی گود میں نہ ہوتی تو شاید کبھی آپ کو اندر آنے کا بھی نہ کہہ پاتا۔ جونہی گھر کی چار دیواری میں آپ داخل ہوئی 'اس بچی پہ درخت کا سایہ پڑا تو مجھے سکون مل گیا۔ دل کی بے چینی کو قرار آگیا۔ اب نہ جانے کیوں مجھے اس بچی سے انسیت ہو گئی ہے۔ کچھ ایسا ہے اس میں کہ میرا دل کرتا ہے میں اس کے سر پر ہاتھ رکھوں۔ اگر آپ کو ذرہ برابر بھی میری نیت میں کھوٹ لگتا ہے تو انکار کا حق محفوظ رکھتی ہیں۔ اس صورت میں میری خواہش یہ بھی ہے کہ آپ ہاں کریں یا نہ کریں۔ یہ بچی میرے پاس ہی رہے۔" رحیم نے ساری بات لرزتوں کی طرف نظر رکھتے ہوئے کی۔ ثمینہ اس سارے دورانیے میں کبھی رحیم کی شکل دیکھتی اور کبھی کمرے میں لیٹی زارا کی طرف دھیان کرتی۔ خاموشی سے سر جھکایا۔ اس جھکے سر میں نیم رضامندی تھی۔ رحیم دبے قدموں سے بغیر کچھ کہے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اذان کی آواز آئی تو ثمینہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

اس معاشرے میں عورت امیر ہو یا غریب ہو 'کنواری ہو یا بیوہ ہو 'تنہا نہیں رہ سکتی۔ اسے ایک نام حوالے کے لیے ہر جگہ دینا پڑتا ہے۔ رحیم کی آواز کا سوز اسے اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں سے آشنا کروا کر نیم رضامندی کو مکمل رضامندی میں تبدیل کرنے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

"حی الفلاح... حی الصلوۃ... اللہ اکبر... اللہ اکبر!"

میں تو خود پر بھی کفایت سے اسے خرچ کروں وہ ہے مہنگائی میں مشکل سے کمایا ہوا شخص

☼ ☼ ☼

زارا کا اپنے ہی اسکول میں بحیثیت استاد آج تیسرا دن تھا۔ گلا خشک ہوچکا تھا اور محنت نے کھلتے ہوئے سنہرے رنگ میں ہلکی سی تپش شامل کردی تھی۔ کل تو اماں بھی گھر میں کہہ رہی تھی کہ آہستہ بولو۔ اسکول میں اونچا بول بول کر اسے آہستہ بولنے سے دشواری ہورہی تھی۔ چھٹا پیریڈ لے کر وہ اسٹاف روم میں آئی تو آگے فریحہ اور شہناز بیٹھی ہوئی تھیں۔ شہناز اس زمانے میں بھی اسی اسکول میں پڑھاتی تھیں جب زارا پانچویں کلاس میں تھی اور فریحہ کا اس اسکول میں پہلا سال تھا۔ زارا کا ٹائم ٹیبل ان دونوں ٹیچرز سے میل کھاتا' فری پیریڈ ایک ساتھ ہی آتے۔

"کیسی جارہی ہے نئی نئی نوکری؟" شہناز نے زارا سے پوچھا۔

"الحمدللہ۔۔۔ اچھی جارہی ہے' بس اونچا بولنا پڑتا ہے۔ گلا دکھنے لگتا ہے۔" زارا نے ہلکا سا مسکراکر جواب دیا۔

"ہاں یہ تو ہے اچھا استاد وہی ہوتا ہے جس کا موثر طریقہ تدریس ہو اور آواز کمرہ جماعت کے آخر میں بیٹھے طالب علم تک بخوبی پہنچتی ہو۔" شہناز نے گویا اپنے تجربے کی پوٹلی سے تھوڑا سا ذائقہ پیش کیا۔

"ایسا ہی ہے۔" تھکی ہوئی زارا کے پاس چکھ لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"مجھے ایک سال ہوگیا ہے' لیکن ابھی تک میرا گلا ہر دوسرے دن خراب ہوجاتا ہے۔" فریحہ نے بھی باتوں میں حصہ لینے کی کوشش کی۔

"ارے لڑکیو! تم تو ابھی بالکل تازہ دم ہو اور یہ حال ہے۔ میں اس بھٹی میں اتنے سال جل کر بھی اپنے گلے کو پکا نہیں کرسکی۔ خاص طور پر نہم بی میں جاکر اسلامیات پڑھاتے ہوئے مجھے ان کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے پورا زور لگانا پڑتا ہے۔" شہناز نے خود کو ان کی فہرست میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے کرتی زارا چونک گئی۔

"نہم بی جو سیڑھیاں چڑھ کر دائیں جانب ہے؟ میں وہاں فزکس پڑھاتی ہوں' مجھے تو وہ کلاس سب سے اچھی لگی ہے۔" زارا بولی۔

"تم مذاق کررہی ہو؟" فریحہ نے حیرت سے زارا کی طرف دیکھا اور سوالیہ نظروں سے سوال داغا' لیکن زارا کی سنجیدگی دیکھ کر اسے زبان ہلانا پڑی۔

"اتنی بدتمیز کلاس ہے کسی صورت قابو میں نہیں آتے۔ آخری دو قطاروں میں بیٹھے ہوئے لڑکوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ وہ ایسی ایسی آوازیں نکالتے ہیں' لگتا ہے جیسے میں کسی چڑیا گھر میں آگئی ہوں۔"

"اچھا واقعی۔۔۔ میری کلاس میں تو سب ہی خاموش ہوتے ہیں اور بڑا اچھا رسپانس بھی دیتے ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ اگر اسی کلاس میں مجھے کچھ اور پیریڈ مل جاتے تو بہتر تھا۔" زارا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہاں اس کلاس میں پیریڈ تمہیں آسانی سے مل سکتے ہیں' کیونکہ مس صائمہ نے پچھلے ہفتے اچانک شادی طے پانے کی وجہ سے اسکول چھوڑا ہے۔ وہ اس کلاس کی کلاس ٹیچر بھی تھی اور چار مضمون پڑھاتی تھی۔ اسی وجہ سے تو تمہیں فوراً" رکھ لیا گیا۔ تمہیں بورڈ کی کلاس بھی اس لیے دے دی گئی کہ تمہارا شمار اس اسکول کے سابقہ ہونہار طالب علموں میں ہوتا تھا' ورنہ اتنی ینگ ٹیچر کو بڑی کلاسز نہیں دی جاتیں۔" شہناز نے زارا کو اس کی تعیناتی کا پس منظر بتایا۔ زارا نے اثبات میں سرہلایا۔

☼ ☼ ☼

اگلے مہینے رحیم نے ثمینہ سے نکاح کرلیا۔ کشور اور سلیم کے لیے یہ اتنا بڑا دھچکا تھا کہ انہوں نے اس پر یقین کرنے کے لیے ولیمہ کے کھانے کو فریز کرکے بار بار کھایا۔ سیڑھیوں کے اوپر نیا کمرہ خالی ہوچکا تھا۔ کشور کو لگتا اب ثمینہ اپنے رنگ ڈھنگ دکھائے گی' کھل کر سامنے آئے گی۔ چست کپڑے پہنے اٹکھیلیاں کرتی

نظر آئے گی' لیکن ثمینہ میں رتی بھر بھی فرق نہ آیا۔ وہ ویسی ہی سادہ اور ملازمہ سی رہی۔ البتہ رحیم کے کام اب ذوق شوق سے کرتی۔ رحیم پہلے زارا کو دور سے دیکھا کرتا تھا' مگر اب اٹھا کر باہر لے جاتا' پیار دلار کرتا۔ واپس آتا تو کوئی نہ کوئی کھلونا زارا کے ہاتھوں میں ہوتا۔ کشور کے دل پر سانپ لوٹ جاتے' لیکن وہ زہر کسی مخصوص وقت کے لیے محفوظ کرتی رہی۔ سلیم اس کا شوہر تھا اور رحیم جیٹھ۔۔۔ لیکن اس کے کپڑے لتے سے لے کر گھر کے راشن تک ساری ذمہ داری رحیم نے اپنے سر اٹھائی ہوئی تھی۔

سلیم چھوٹا ہونے کی وجہ سے ذمہ داریوں سے آزاد تھا۔ گھر کے ساتھ بنی یہ مسجد رحیم اور سلیم کے والد نے بنائی تھی۔ اس سے رحیم کی قلبی وابستگی بھی تھی اور یہی روزی روٹی کا ذریعہ بھی تھا۔ وہ اس مسجد کا موذن بھی تھا اور خادم بھی۔ سلیم اس ذمہ داری سے مکمل طور پر بری الذمہ تھا۔ گھر سے کچھ دور پانچ دکانیں بھی تھیں۔ جن میں سے چار کا کرایہ رحیم لے رہا تھا اور ایک کا سلیم۔ محنت رحیم کی ہی تھی' لیکن وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا' مگر اب سکون کے سمندر میں پہلا کنکر گرچکا تھا۔ زارا پاؤں پاؤں چلنے لگی تو ثمینہ کی زندگی میں نجات دہندہ بن کر آنے والا بڑی خاموشی سے چلا گیا۔ عصر کی اذان دیتے دیتے موت کے فرشتے نے رحیم کی روح یوں قبض کی جیسے کلیاں چٹختی ہیں۔ ایک سکون بھری ہچکی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ابھری اور محلے کے ہر گھر میں سنی گئی۔ کچھ چھن سے ثمینہ کے اندر ٹوٹا۔ صحن کے اندر کھیلتی زارا کو اسی وقت ٹھوکر لگی تھی۔ کچھ اتفاق کتنے برے لگتے ہیں' ان کا اتفاقیہ ہونا زندگی کی بہت سی کڑیوں کو اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ انسان کی نگاہ رحم کی طلب میں آسمان پر فریاد کے پرندے بھیجنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

کشور کو اپنا زہر استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ رحیم خاموشی سے چلا گیا تھا۔ ثمینہ شاید اگلے دن سڑک پر ہوتی' لیکن رحیم کی جیب سے نکلی وصیت نے اس گھر میں قدم جما دیے۔ وہ وصیت محلے کے بزرگ نے پڑھی۔ جس کے مطابق مکان ثمینہ اور اس کی بیٹی کے نام کردیا گیا تھا۔ یعنی وہ کم گو سا شخص' کم عقل نہیں تھا۔ ثمینہ ویسے ہی بے ضرر تھی' لیکن کشور نے ثمینہ کو اوپر والے کمرے میں منتقل کردیا اور شام میں سیپارہ پڑھنے کے لیے آنے والیوں کو پڑھانے کی ذمہ داری خود لے لی۔ یہ وہ صدقہ جاریہ تھا جو ثمینہ نے رحیم کی اجازت سے شروع کیا تھا' لیکن اس کی موت سے وہ اچھوت' سلیم شاہ اور کشور شاہ کی مالکن بن گئی۔

سلیم مسجد میں خادم اور گھر میں شاہ بن گیا۔ بھلا ہوا کہ دونوں کو اللہ نے اگلے ہی سال ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ اب نہ جانے یہ بیٹی کے پیدا ہونے پر دل نرم ہوا تھا یا شکرانے کا طریقہ تھا کہ سال سے ضبط کیا جانے والا رحیم کی دکانوں کے کرائے کا کچھ حصہ ثمینہ کو ملنے لگا۔

☼ ☼ ☼

زارا کی بہت کم خواہشیں تھیں جو پوری نہ ہوئی ہوں۔ وہ پرآسائش زندگی نہیں گزار رہی تھی' لیکن

اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی پوری ہوتیں کہ اس کے آس پاس رہنے والوں کو لگتا جیسے کچھ غیبی قوتیں صرف زارا کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کرتی ہیں۔ جیسے دانہ چگنے پرندوں کا آجانا نوکری مل جانا اماں کو سلائی کے پیسے زارا کی دعا کے فوراً بعد مل جانا اور ابھی بھی اسے نہم بی میں تین پیریڈ مل گئے۔ ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے پورا ہوجانے کو کچھ نہیں سمجھتے، کیونکہ ہم ان کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بالکل ہوتی ہے بلکہ بے حد ہوتی ہے۔ مگر ان کے بعد زندگی کا تصور نہیں ہوسکتا اس لیے یہ بہت اہم اور چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری ہونے پہ ہمارے سر کو شکر میں نہیں جھکا سکتیں۔

وہ نہم بی کا حاضری رجسٹر لے کر بیٹھی تھی۔ رجسٹر سے ایک صفحہ نکلا اس صفحے پر بہت خوب صورتی سے یہ غزل لکھی ملی۔ اس نے یہ صفحہ اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیا اور کلاس میں جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"بیٹا پانی لادو!" اس نے سب سے پہلی رو میں بیٹھے لڑکے کو مخاطب کیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ گھر میں بھی اگر کبھی کوئی ٹیوشن پڑھنے آتا تو وہ اسے بھی بیٹا کہہ کر بلاتی، اگرچہ اسکول کے نویں کلاس کے بچوں اور اس کی اپنی عمر میں اتنا زیادہ فرق نہیں تھا لیکن پھر بھی زارا کو ایسے بلانا اچھا لگتا تھا۔ اگر یہ کلاس اتنی فرماں بردار نہ ہوتی تو زارا اپنے طرز تخاطب پر ضرور سوچتی۔ جس لڑکے کو زارا نے بلایا تھا اس نے سب سے آخری قطار میں بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا۔ زارا اس کی نظروں کا پیچھا کررہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"مس اس کی ڈیوٹی ہے پانی پلانے کی۔" اگلی قطار والے صائم نے کہا۔ زارا نے پھر سے پچھلی قطار والے زین کو دیکھا۔

"زین بیٹا۔۔۔ آپ لے آؤ پانی!" زین کا چہرہ سرخ ہوا اور کلاس میں موجود بچوں نے صاف صاف اپنی مسکراہٹ دبائی۔ زارا کو کچھ عجیب سا لگا، مگر دو منٹ بعد زین پانی لے کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دوپٹے کے نیچے اپنے گھنے بالوں کو ایک پن سے سمیٹا ہوا تھا۔ اسی لمحے پن کھلی۔ زارا نے زین کے ہاتھ سے گلاس تھاما اور ساتھ ہی اس کے سر سے دوپٹا سرکا۔ ایک ہاتھ سے گلاس تھامے اور دوسرے ہاتھ سے دوپٹا سنبھالتے زارا واقعتاً ہچکچائی۔ لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں، وہ چھوٹے یا بڑے نہیں ہوتے، ان کی آنکھوں کی جگہ دوربین فٹ ہوتی ہے۔ زارا سخت مضطرب ہوئی۔ اسی لمحے زین اس کے عین سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور گلاس واپس پکڑ لیا۔ زارا نے تشکر آمیز نگاہیں اٹھا کر زین کو دیکھا اور فوراً سے بال سمیٹ کر دوپٹا سیٹ کرلیا۔ پانی پی کر زارا کا اعتماد بحال ہوچکا تھا۔ اس نے آرام و سکون سے اپنا لیکچر دیا اور پھر کلاس سے باہر نکل آئی۔

"بات سنیں!" پیچھے سے آواز آئی۔ زارا نے رخ موڑ کر دیکھا۔ یہ زین تھا۔

"جی بیٹا!" زارا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ مجھے بیٹا نہ کہا کریں۔" نظریں جھکا کر اپنی بات کہہ کر وہ جاچکا تھا۔ زارا حیرت سے کھلا منہ لیے اکیلی کھڑی رہی۔ کٹوریوں میں پڑا باجرہ پرندوں کا منتظر تھا اور وہ رزق کی تلاش میں یہاں وہاں پرواز کررہے تھے۔

☆ ☆ ☆

کمرے کے درودیوار میں مشین کی گھرر گھرر گونج رہی تھی اور نفوس کے لیے معمول کی بات تھی۔

"اماں آپ کیوں محبت، محبت کرتی رہتی ہیں؟" زارا حیرت سے سلائی مشین پر جھکی ماں سے پوچھ رہی تھی۔

"تم کیوں اماں اماں کرتی ہو؟" ثمینہ نے سلائی مشین پر جھکے جھکے ہی پوچھا۔ "کیونکہ میری اماں میری زبان سمجھتی ہے۔ آپ جن کے سامنے محبت کا راگ الاپ رہی ہیں اور جن کی خدمت میں اپنی ہڈیاں گلا رہی ہیں، ان کو آپ کی بالکل ضرورت نہیں۔ کل کو انہیں یہ کام آپ کے ذریعے سے پورے ہوتے نہ ملیں تو یہ کوئی نوکرانی رکھ لیں گے۔" زارا نے کشور بیگم کی قمیص کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا، جسے ثمینہ بڑی ہی نفاست سے سی رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، محبت کی کوئی زبان ہوتی ہے؟" ثمینہ نے سلائی چھوڑ کر اپنی معصوم بیٹی کو دیکھا۔

"اور کیا نہیں ہوتی زبان؟" زارا نے جواب میں سوال ہی پوچھا۔

"نہیں، محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ جیسے روشنی زمین تک کا سفر طے کرتی ہے اور پتا بھی نہیں لگتا۔ اسے کسی سواری کی بھی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ جیسے بارش برستی ہے اور پلک جھپکتے ہی موسم بدل جاتا ہے۔ اسی طرح محبت لمس ہے محبت احساس ہے، یہ پتھر پر پڑنے والی مسلسل دستک ہے۔ جو جونک لگا ہی دیتی ہے۔ محبت اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے۔ محبت کی اگر کوئی مخصوص زبان ہوتی تو جانوروں کو کہاں سمجھ آپاتی؟ کتا کاٹ لے تو چودہ ٹیکے لگتے ہیں۔ اسی کتے کو محبت کا یقین ہوجائے تو آپ کے تلوے چاٹ لیتا ہے۔ آپ پر آنے والی مصیبت پر اتنا بھونکتا ہے کہ مصیبت کو لگتا ہے کہ وہ خود مصیبت میں آگئی ہے۔ اگر جانور محبت کو محسوس کرلیتے ہیں تو کیا انسان نہیں کرسکتے؟ مجھے دستک دینے دو! دروازہ کھولنا ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ دروازہ اوپر کھولے گا اور وہاں سے کھولے گا جہاں سے امید بھی نہیں ہوگی۔" ثمینہ نے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بیٹی کو سمجھایا۔

"آپ کی فلاسفی کا جواب ہی نہیں ہے۔ یہ بتائیں اب کون سا دروازہ کھلوانا ہے؟" زارا نے شرارت سے کہا۔

"ہنستی رہا کرو۔۔۔ اللہ تمہیں ہنستا رکھے!" ثمینہ نے صاف صاف جواب ٹالا۔

"یعنی اب آپ نے جواب نہیں دینا۔" زارا بھی اس ٹال مٹول کی عادی تھی، لیکن پھر بھی پوچھے بنا نہیں رہ سکی۔ ثمینہ کی خاموش مسکراہٹ دیکھ کر باہر چھت پر آگئی۔ کھونٹی پر ٹنگے لفافے سے باجرہ نکالا اور مٹی کی کٹوریوں میں ڈال دیا جو منڈیر پر دھری تھیں۔ اب اس کے دوستوں نے پر پھیلا کر آنا تھا اور زارا کی موجودگی کی پروا کیے بغیر دانا چگنا تھا۔ زارا نے منتظر آنکھیں آسمان پر ٹکادیں۔

☆ ☆ ☆

فری پیریڈ تھا۔ زارا جونہی اسٹاف روم میں داخل ہوئی فریحہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ انسان ایک چیز جب کسی دوسرے کے پاس دیکھتا ہے تو اس کے حصول کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کے یہ چیز اس کے لیے اچھی ہے بھی یا نہیں۔ اگر وہ چیز آپ کے حق میں بہتر ہوتی تو آپ کو ہی ملتی۔ کسی اور کو کیوں ملتی؟ کیا اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا نہیں ہے؟ جو ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر چیزوں کو مان لینا، سر جھکا دینا انسان کو اور خوشی دیتا ہے۔

"تمہیں پتا ہے؟" فریحہ نے بہت عام سے لہجے میں زارا سے پوچھا "نہم کلاس کا زین کہتا ہے کہ اسے مس زارا بہت پسند ہیں اور وہ ان سے شادی کرے گا۔" فریحہ کے انداز میں حسرت، طنز اور حسد بیک وقت منہ کھولے نظر آئے۔ ان جذبات نے اس کے لفظوں کو اور بھی تلخ کردیا۔ جیسے زہر میں ڈوبا ہوا تیر۔۔۔ زارا ایسے حال میں تھی کہ وہ اس اچانک حملے کے رد عمل کو چھپا نہ سکی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے رفتن۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ پارسائی اس کا واحد ہتھیار ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ بول سکی، اس کی نظروں کے سامنے زین کا چہرہ آگیا۔ آپ مجھے بیٹا نہ کہا کریں۔ اس نے کہا تھا اور اس کے ایک جملے کی وجہ سے زارا کے پاس کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

"اب کم از کم یہ ظاہر تو نہ کرو کہ تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔" اسے خاموش دیکھ کر فریحہ پھر گویا ہوئی۔

"مجھے واقعی نہیں پتا۔" زارا نے شاک کی کیفیت پہ بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہی سچ ہے۔" فریحہ نے اطمینان سے ٹانگ

ہلاتے ہوئے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر کہا جیسے اس وقت اس سے اہم کام کوئی نہ ہو۔

"آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟" زارا ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگی۔

"تمھی ایک تم ہی ہر دل عزیز نہیں ہو۔ کچھ وقت میں نے بھی اسکول کو دیا ہے۔ بچے مجھ سے بھی پیار کرتے ہیں۔ وہ والا نہیں جو زین تم سے کرتا ہے۔" لوہا گرم تھا اور فریحہ مسلسل ضرب لگا رہی تھی۔

"آپ کو ایسی بات کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے... آپ خود ایک لڑکی ہیں... آپ کو چاہیے تھا کہ ایسی بات بتانے والے کے بھی کان کھینچتیں اور یہ بات وہیں ختم کر آتیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اب یہ بات میرے سامنے یا کسی کے سامنے نہ دہرایئے گا۔" زارا نے کڑوے کسیلے لہجے میں فریحہ کو کہا۔ فریحہ بھول گئی تھی کہ ضرب کی آواز اگر گونجے تو بہت گونجتی ہے۔ گونج سن کر وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی' اسے زارا جیسی عاجز اور ملنسار لڑکی سے ایسے سخت اور روکھے جواب کی توقع نہیں تھی۔ کہنے والے چاہتے ہیں کہ سننے والے بے زبان ہو جائیں۔

زارا نے کرسی کے ساتھ پڑی پانی کی بوتل اٹھائی اور کھول کر منہ سے لگالی۔ ایک ایک گھونٹ ایسے اندر اترا جیسے پشت میں کوئی خنجر اتار رہا ہو۔

"اماں کو پتا چل گیا تو؟ سلیم چچا کو علم ہوا تو؟ کشور چچی کو بھنک پڑ گئی تو؟" ہزاروں اندیشوں کے وسوسے اس کے دامن سے ناگ بن کر لپٹنے لگے۔

"زارا!" مسز شہناز نے زارا کو آواز دی۔ زارا تو بھول ہی گئی تھی کہ وہ بھی اسی کمرے میں بیٹھی تھیں۔

"جی..." اس نے بمشکل جواب دیا تھا۔ بات یہاں تک رہے گی یا کہاں تک جائے گی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

"ادھر آؤ میرے پاس!" مسز شہناز نے زارا کو بلایا۔ اس وقت واقعی حرف تسلی کی حاجت تھی۔ وہ میکانکی انداز میں چلتی ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

"پریشان نہ ہو۔" انہوں نے زارا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔

"کسی کو پتا چل گیا تو؟" ڈر لبوں پر آگیا۔

"کون بتائے گا؟" مسز شہناز کو لگا کہ وہ ان کے حوالے سے بھی اس راز کو غیر محفوظ محسوس کر رہی ہے۔

"فریحہ!" زارا نے ہچکچاتے ہوئے نام لیا۔

"تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ ساری بھابھیاں خاندان سے آئی ہیں اور اس کے ماموں کے سگے بیٹے نے اس سے منگنی ختم کروالی ہے۔ اب وہ غیروں کے سامنے روز بن سنور کر جاتی ہے۔ اتنی تلخ ہو سکتی ہے' لیکن جتنا تم سمجھ رہی ہو اتنی بری نہیں... بے فکر رہو۔" مسز شہناز نے بہت تسلی آمیز لہجے میں زارا کو سمجھایا تو زارا کو اپنی کڑواہٹ کا احساس ہوا۔ اچھے لوگوں کو برا کرنے پر ضمیر کی مار فوراً پڑتی ہے۔

"اور زین؟ مجھے اس بات کے سر پیر کی سمجھ نہیں آرہی۔ اگر اس نے یہ بات کسی کے سامنے کی تو مجھے اسکول چھوڑنا پڑے گا۔" زارا کا مسئلہ ابھی بھی وہیں تھا۔

"زین والی بات پر تو میں بہرحال خود پریشان ہوں... وہ اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ تھوڑا اکھڑ ضرور ہے' لیکن ایسی بات اس کے حوالے سے کبھی نہیں سنی گئی۔ پتا نہیں' یہ افواہ کس نے اڑائی ہے تم پریشان نہ ہو... وہ میرے گھر کے پاس رہتا ہے' میں کل تک دیکھ سمجھ کر بتاتی ہوں... تم پریشان نہ ہو۔" مسز شہناز نے اس کے بجھے بجھے چہرے کو تھپتھپایا۔ یہ اور بات کہ زارا کا سارا دن پریشانی میں اور پریشانی چھپانے میں گزرا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت چھوٹا تھا جب اسے ایک سائیکل پسند آگئی۔ ایسی پسند آئی کہ سب خواہشوں پہ بھاری ہو گئی۔ اس نے واقعتاً "اوپر کی مٹی نیچے اور نیچے کی مٹی اوپر کر دی۔ اس کی ماں سلطانہ کو لگا کہ بچہ ہے۔ ابھی سنبھل جائے گا۔ لیکن اس نے ایسی ضد پکڑی کہ شام ڈھلنے سے پہلے ماں کو سائیکل گھر لانی پڑی۔ سائیکل آئی تو یوں لگا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اس نے اپنے تین کمروں کے گھر میں سائیکل کو یوں گھمایا جیسے چپا چپا دکھا رہا ہو۔ کوئی اپنی ایسی شے نہ چھوڑی جسے سائیکل کے ساتھ لگایا جا سکتا ہو۔ سائیکل نمائش اور ستائش کے قابل لگنے لگی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ کمرے حبس سے گھٹن پکارنے لگے۔ سلطانہ نے اپنی اور بیٹے کی چارپائی باہر صحن میں بچھادی۔ بیٹا بھی سائیکل کو چارپائی کے ساتھ رکھ کر ہی سویا۔ ہوائیں کبھی ٹھنڈی ہوتیں اور کبھی جامد۔ سلطانہ کی آنکھ پیاس سے کھلی تو وہ سائیکل بھول چکی تھیں۔ سائیکل' لیکن وہیں موجود تھی۔ سلطانہ نے ٹھوکر کھائی... اور گر گئیں۔ رات کی خاموشی کو نگلنے والی آواز نے نیند کے دیوی کو بھی اپنے شکنجے میں لے لیا۔ بیٹا اٹھ بیٹھا۔ ماں کی چوٹ دیکھی تو مندی آنکھوں سے ہی سائیکل گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا۔ وہ سارے تمغے' وہ سب سوغاتیں' جو اعزاز کی طرح ساتھ ٹانگی گئیں' اندر صحن میں ہی رہ گئیں۔ ماں کے بہتیرا سمجھانے کے باوجود سائیکل گلی میں پھینک دی گئی۔ اس کے بعد گھر کی مٹی نے ضد کو سر اٹھاتے نہ دیکھا۔

وہ ایسا ہی تھا ناقابل یقین سا! جو سوچ لیتا' کر کے دکھاتا۔ جو ٹھان لیتا' اس سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹتا۔ کھڑا ہو جاتا تو کوئی بٹھانے والا نہ تھا اور اگر بیٹھ جاتا تو کوئی اٹھانے والا نہ تھا۔ شہد رنگ آنکھوں سے ذہانت اور شرارت ایک ساتھ چمکتی۔ یقین لانے والے ایک سیکنڈ میں یقین لاتے اور پیچھے چلتے رہتے۔ بدکنے والے بدکے ہی رہتے۔ ان کے لیے بھروسا کرنا مشکل ہوتا۔ ایک بات طے تھی کہ وہ یقین لانے والوں اور بدکنے والوں کے درمیان خود حد فاصل طے کرتا...
مضبوط ہاتھوں اور لمبی بھنوؤں میں وہ سب کچھ تھا جو مقابل کو خاموش کروا سکے۔ وہ بہت بڑا نہیں تھا' لیکن وہ چھوٹا بھی نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ دنیا میں ایک چہرے کے ہزاروں لوگ ہیں' لیکن اپنے چہرے اور دل کے ساتھ وہ اس دنیا کا واحد عجوبہ تھا۔ خاموش ہوتا تو خاموشی بولنے لگتی۔ ضد کرتا تو التجائیں آنکھوں میں سما جاتیں۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا اس کی آنکھوں میں کسی نے نمی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر کا واحد مرد تھا اور مرد کی تعریف پہ پورا اترنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس میں وہ اتنا کامیاب ہو چکا تھا کہ سلطانہ اب خود کو اس کی غیر موجودگی میں بھی اکیلا نہ سمجھتیں۔

کچھ عجیب سے بال جن کو نہ تو گھنگھریالا کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی سلکی... اس سے بھی عجیب مسکراہٹ جس کے تمسخر اور خلوص میں فرق کرنا مشکل ہوتا... تھوڑی بھاری سی آواز... اور سینے پہ ہاتھ لپیٹ کر بات کرنے کا انداز... اس کی ہر حرکت مختلف تھی۔ نہ وہ ممی' ڈیڈی قسم کا لڑکا تھا کہ لٹک لٹک کر چلتا اور نہ ہی بہت مدبر کہ نگاہیں جھکا کر رکھتا۔ وہ متوازن اور معتدل تھا۔ اپنی ذات میں مکمل تھا۔ نپے تلے قدم اٹھاتا اور مسکراتی آنکھوں کے ساتھ اگلا قدم دل کی نگری میں رکھتا۔ اسے دیکھ کر لاڈ آتا۔ سلطانہ کو لگتا کہ ماں ہونے کی وجہ سے صرف اس کا دل نرم پڑتا ہے' لیکن پھر زین نے جہاں جہاں قدم رکھے' چاہے سیپارہ پڑھنے گیا ہو یا آٹا لینے گیا ہو۔ لاڈ اضافی لایا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ وہ زین عباسی تھا۔

☼ ☼ ☼

"الم ذرا زور سے بول... بولو الم... جذب سے پڑھو... لام اور میم کو اور کھینچو!" نشا کالا دوپٹا لپیٹے قرآن پڑھنے آئے ہوئے بچوں کو سمجھا رہی تھی۔ زارا نے اوپر سے نشا کو دیکھا۔ اگر کوئی خوب صورت ہو تو یہ اتنی بڑی بات نہیں' لیکن اگر کسی کو علم ہو جائے کہ وہ خوب صورت ہے تو بات خود ہی بری ہو جاتی ہے۔ نشا سلیم چچا اور کشور چچی کی بیٹی تھی۔ گورے رنگ پر سیاہ دوپٹا اوڑھ لیتی تو نظر اس سے ہٹنے سے انکاری ہو جاتی۔
زارا سے دو سال چھوٹی نشا میں تھوڑا نخرا تھا اور بہت سی ادائیں' لیکن سب سے بڑھ کر اس کا دل تھا جو بہت جلدی پسیج جاتا۔ زارا کو یاد تھا بچپن میں جب دکان کا کرایہ چھ ماہ تک دکان خالی ہونے کی وجہ سے نہیں آیا تو یہ نشا ہی تھی جو پلیٹ میں بچی روٹی منڈیر پر رکھ کر چلی

جاتی۔ گڑیا پرانی ہوجاتی تو اسے سیڑھیوں پر پھینک آتی۔ کبھی بھولے سے دوبارہ اس کھلونے کا تذکرہ نہ کرتی جو سیڑھیوں پر چھوڑ کر آتی۔ کوئی چیز چاہیے ہوتی تو زارا منڈیر سے چپکی رہتی کہ نشا اکیلی صحن میں نظر آئے اور وہ اس سے مانگ سکے اور مانگنے کی بھی نوبت نہ آتی۔ نشا آنکھ بچاکر اوپر دیکھ لیتی اور سمجھ جاتی کہ کاپی ختم ہوگئی ہے اور خالی صفحات درکار ہیں۔

کبھی کشور بیگم کی نظر زارا پر پڑ جاتی تو وہ صلواتیں سناتی کہ زارا کے پاؤں اس کا وزن برداشت کرنے کے قابل نہ رہتے اور وہ ڈھے جاتی۔ ثمینہ مشورہ دیتی کہ چیز کے بغیر گزارہ کرلو۔ عزت کا سودا نہ کرو۔ اس لمحے نڈھال ہوتے وجود کو یہ مشورہ ادرک کے سواد جیسا لگتا۔ وقت نے موسموں کی رفتار سے شرط لگائی اور سالوں بعد نشا بھی اپنے والدین کے رنگ میں رنگی گئی۔ زارا کو یقین تھا کہ اگر وہ زارا کی کالی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لے تو بچپن کی شناسائی پرواز کرکے لہجے میں اتر آئے گی، لیکن آنکھوں میں جھانکنے کا وہ جو ایک لمحہ تھا... وہی نہیں ملتا تھا۔

آج اسکول سے بھی ایسی پریشانی ہاتھ لگی تھی کہ ماں کے سامنے بیٹھتی تو پھٹ پڑتی اور پھر ماں کے شق کلیجے کو کیسے مرہم لگاتی؟ ماں الزامات سے ہی تو ڈرتی تھی۔ بچوں کو قرآن پڑھانے کا رواج ثمینہ نے ہی ڈالا تھا لیکن رحیم کی بےوقت موت پر محلے والوں کا ثمینہ کو عزت دینا کشور بیگم کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ وہ جانتی تھی، اگر ثمینہ استانی بنی رہی تو عزت کمالے گی اور گھر کی باتیں باہر نکل جائیں گی۔ اس سوچ نے کشور بیگم سے وہی کروایا جو وہ کرسکتی تھی۔ انہوں نے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور ثمینہ کو کنارے لگادیا۔

"مجھے جو بھنور لگ رہا ہے کہیں وہ کنارہ تو نہیں۔" کہیں اندر سے کوئی زارا سے ہمکلام ہوا۔

"اف یہ دھیان کیوں بار بار اس طرف جارہا ہے۔ جہاں نہیں جانا چاہیے۔" زارا کے دماغ نے اس کے دل سے ہم کلامی کی۔ نشا نیچے صحن میں بیٹھی بائیں ہاتھ سے اپنی پشت دبا رہی تھی۔ دفعتاً" نظر زارا پر پڑی۔

"اگر تمہاری طبیعت نہیں ٹھیک تو آج میں بچوں کو پڑھادوں؟" زارا نے لمحے کو قید کرنے کی سعی کی۔

"نہیں میں پڑھالوں گی شکریہ!" وقت کے پروں نے لمحے کی قید سے رہائی کرلی۔ نشا نے گردن نیچے کی اور بچوں سے کہنے لگی۔

"ذرا زور سے پڑھو الم..."

☼ ☼ ☼

اسکول آنا پہلے بھی کوئی نعمت مترقبہ نہیں تھا، اب تو سوہان روح لگنے لگا۔ پہلا پیریڈ ہی نہم جماعت میں ہے۔ میں کیسے جاؤں گی۔ سوچ کے گرداں میں گرد اڑاتے ہوئے ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے نکالے اور ان کا دوپٹا ڈھونڈنے لگی۔

"یہ گلابی دوپٹا پہن جاؤ!" ثمینہ نے کنٹراسٹ میچنگ کروانے کی کوشش کی۔

"گلابی رنگ سوٹ کرتا ہے، میں یہ نہیں پہنوں گی!" زارا نے دل میں سوچا اور بولی۔ "اس کے ساتھ کا سفید ہی پہنوں گی۔ مل جائے گا اماں۔" چھوٹی سی الماری میں دوپٹا کہاں کھونا تھا، سو مل ہی گیا۔ اس نے دوپٹا پہنا اور چہرے پر اسکارف کی طرح لپیٹ لیا۔ بےسکون سی نیند نے آنکھوں کے ڈورے نمایاں کردیے تھے اور رات بھر کمرے میں مچھر بتی کے جلنے سے جلد بھی حساس ہوکر سرخ ہورہی تھی۔ حسن بھی خوشبو اور عشق کی مانند ہے، چھپائے نہیں چھپتا۔ سفید رنگ میں بھی اس کی معصومیت کلیوں کی طرح چٹخنے لگی۔ اپنی طرف سے وہ ساری احتیاطی تدابیر کرکے اسکول پہنچی۔ آج اس کی اور مسز شہناز کی گراؤنڈ میں ڈیوٹی تھی۔

"السلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ؟" زارا بڑے تعظیمی انداز میں بولی۔ اسے ان کا کل کا حسن سلوک یاد آیا۔

"الحمدللہ میں ٹھیک، تم سناؤ۔" مسز شہناز نے ہشاش بشاش لہجے میں جواب دیا۔

"میں پریشان..." زارا نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ مسز شہناز نے اس کی بات پکڑلی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل میں نے بات کی تھی زین سے... جو گڑ سے مرتا ہو اسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں!" زارا واقعی نہیں سمجھی۔

"دیکھو اس عمر میں لڑکے اکثر اپنی استانی یا کسی بڑی عمر کی لڑکی کو پسند کرنے لگتے ہیں... میں نے زین سے اس بارے میں بات کی تو اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس بات کی تائید کی... میں اسے عرصہ دراز سے جانتی ہوں، وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے ذرا سا بھی شرمندہ نہیں ہوا۔ بس شاید میرا لحاظ کرگیا، ورنہ تمہاری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا، لیکن میں سمجھتی ہوں یہ وقتی جوش ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نوعمر لڑکوں کو جس طرف جانے سے روکو وہ وہیں سے سر نکالتے ہیں... لہٰذا تم بے فکر ہوجاؤ۔ چار چھ ماہ کی بات ہے، اس کے سر سے بھوت اتر جائے گا۔ کسی دن ڈانٹ پڑ گئی تم سے یا تم نے تھپڑ لگادیا تو بالکل ہی تم سے متنفر ہوجائے گا۔ یہ بات مجھے، تمہیں اور فریحہ کو پتا ہے۔ تم کسی کو بتاؤگی نہیں۔ فریحہ نے کسی کو بتانا نہیں ہے اور میرے بارے میں بے فکر رہو۔ زین بھی چاہتا ہے کہ یہ بات فی الحال اس کے گھر تک نہ پہنچے۔ شاید اسے خود بھی اندازہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر نادانی کر بیٹھا ہے۔" مسز شہناز نے اسے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی، اس سب میں میرا کیا کردار ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے، زارا کو ابھی بھی آگے کیا ہوگا۔" کھانے لگا۔

"تم اسے نظرانداز کرو۔ وہ اگر کہتا ہے تم اسے بیٹا کہہ کر نہ بلاؤ تو نہ بلاؤ۔ اس کے ساتھ میٹھی بھی نہ بنو کہ وہ تمہیں تھام لینے کی سوچنے لگے۔ فاصلہ رکھو اور اس کو مت چھیڑو۔ ضد پر نہ لے کر آؤ۔ زبردستی کوئی بھی کام نہ کرواؤ۔ وہ سبق سناتا ہے یا نہیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ آگ ہے اسے چھیڑوگی تو جل جاؤگی۔ مجھے پتا ہے تمہیں اسے چھیڑنے کا شوق نہیں ہے، لیکن احتیاطاً" کہہ رہی ہوں تم اس کی مصلح بن کر اسے راہ راست پر لانے کی کوشش بھی نہ کرو۔ بس خاموشی اختیار کرو۔" مسز شہناز نے بردباری سے سمجھایا اور گراؤنڈ کے دوسری طرف چلی گئیں۔ زارا نے بس اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا اور مرکزی دروازے کی طرف چلی گئی۔

زین اسکول میں داخل ہورہا تھا۔ اس نے نظر اٹھاکر زارا کو دیکھا اور معصومیت نے دل موہ لیا۔ وہ مسکرایا۔ زارا نے منہ موڑلیا، اس کے پاس اس کھلنڈرے سے لڑکے کی مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسکول سے نکل کر زارا کو محسوس ہوا کہ کوئی پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ تپتی دوپہر میں کسی کو کیا تکلیف ہے یہ سوچ کر زارا کو سخت کوفت ہوئی۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کون ہوسکتا ہے، لیکن پھر سوچا اندازہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ ضرور زین ہوگا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ زین نہیں تھا وہ تیز قدموں سے گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

زین کا رویہ نارمل ہی تھا۔ کچھ عجیب تھیں تو اس کی آنکھیں، یا شاید اس کی ساری شخصیت ہی... اس کے اٹھنے بیٹھنے میں ایک خاموش سا رعب بولتا۔ نظروں کے جھکنے، اٹھنے میں عجیب خوداعتمادی بولتی۔ وہ کھلنڈرا بھی لگتا اور حساس بھی۔ لبوں کے اوپر آیا، بالوں کا رواں اس کے جوان ہونے کی چغلی کھاتا۔ کہنیوں تک مڑی ہوئی آستینیں دیکھنے والے کو پورے زور سے کھینچتی۔ زارا اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی، لیکن بدنامی اور رسوائی کا ڈر مجبور کردیتا تھا کہ وہ زین کا بغور جائزہ لیتی رہے۔

ابھی نہم کلاس سے لیکچر دے کر نکلی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور سورج کی تپش نے اپنے معنی کھودیے۔ یوں لگا جیسے شام تک تیز آندھی ضرور آئے گی۔ گھر

میں اکیلے کمرے پر تپتا سورج کمرے کو کچھ اور بھی گرم کردیتا تھا۔ زارا نے خوشی سے بڑے لمبے سانس لیے اور اسٹاف روم کی طرف آگئی۔ وہ نیچے اتر رہی تھی۔ سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جو کل پیچھا کرتے گھر تک آگیا تھا۔ زارا اندر سے کانپ اٹھی۔ وہ زارا کی طرف پشت کرکے اور ٹانگیں کھول کر یوں کھڑا ہوگیا کہ اس کے گزرنے کا راستہ مسدود ہوگیا۔ اس حرکت کا مقصد صاف واضح تھا کہ زارا اسے بلائے اور اس سے راستہ مانگے۔ زارا کا حلق خشک ہوگیا۔ ابھی جو بارش رحمت لگ رہی تھی وہی زحمت لگنے لگی۔ دکان کی ٹپکتی چھت یاد آگئی۔ نہ دکان کی چھت ٹپکتی اور نہ اسے پڑھانے آنا پڑتا۔ نہ ان عجیب رنگوں والے لوگوں کے منہ لگنا پڑتا۔ "کاش کوئی سہارا ہوتا تو مجھے گھر سے باہر نکل کر ایسے گھٹیا لوگوں کے منہ ہی نہ لگنا پڑتا۔" اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھر گئیں، مگر وہ لب سیے گم صم کھڑی رہی۔

"بات سنیں!" آواز پیچھے سے آئی۔ زارا نے مڑ کر دیکھا تو زین تھا۔ زارا نے بے چارگی سے دیکھا۔ آگے کنواں تھا اور پیچھے کھائی۔ زین نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں اور دوسری نظر ناک کے چمکتی لونگ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے وہ اس لڑکے کے سر پر تھا۔

"اندھے ہو کیا؟ دکھائی نہیں دیتا؟"

"اوہو… میں نے تو دیکھا ہی نہیں۔" وہ لڑکا مسکرایا اور جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔

"اب نکلو یہاں سے… نہیں تو میں تمہیں دیکھ لوں گا۔" زین نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر دبایا تو وہ لڑکا سٹپٹا گیا اور راستے سے ہٹ گیا۔ اب سیڑھیوں پہ صرف زین اور زارا تھے۔

"اس لڑکے کا نام عاقب ہے۔ تم اس کی شکایت کردو۔" زین نے نظریں جھکا کر کہا۔ پہلے تو زارا کو عجیب سی طمانیت سی محسوس ہوئی، لیکن پھر دماغ نے انتہائی غصے میں رد عمل دینے کا سگنل دیا۔

"بڑی ہوں میں تم سے… آپ کہو! تمہاری [illegible] ہوں۔ جی چاہتا ہے اس کی شکایت کرنے سے پہلے تمہاری شکایت کردوں، لیکن پرائیوٹ گلی محلے کا اسکول ہے۔ تم جیسے لڑکوں کی خبر لینے کے بجائے وہ میری جگہ کسی عمر رسیدہ ٹیچر کو رکھنے کو ترجیح دیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ نوکری میری ضرورت ہے۔" زین نے اسے ہاتھ کو مسلتے ہوئے بغور دیکھا۔ وہ خود کو بڑا کہنے والی شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔

"سب کے سامنے تو آپ ہی کہتا ہوں نا… اور بڑی تو ہو نہیں… جتنے سال میں تم نے انٹرمیڈیٹ کیا ہے، میں نے اتنا عرصہ قرآن پاک حفظ کرنے میں لگایا ہے۔" اس نے زارا کے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بہت اعتماد سے کہا۔ زین راستہ چھوڑ کر کھڑا تھا۔ وہ چاہتی تو بڑی آسانی سے جاسکتی تھی، لیکن پتا نہیں کیوں وہ وہاں رکی ہوئی تھی۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی حافظ قرآن ہوں۔" زین نے ایک لحظے کے لیے پھر اس کے ناک میں چمکتے لونگ کو دیکھا اور نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اسی لیے تمہاری ناک کی لونگ اتنی زیادہ چمکتی ہے۔" زارا کے پاؤں سے لگی اور سر پر بجھی۔

"اچھے خاصے شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہو اور تمیز چھو کر نہیں گزری… کیا مجھے تم… تم کہہ کر بلا رہے ہو… حافظ قرآن ہونے اور لونگ چمکنے میں کیا ربط ہے… جاؤ پہلے سیکھ کر آؤ کہ کیسے احترام کرتے ہیں، اساتذہ کا رتبہ کیا ہے، پھر مجھ سے آکر بات کرنا۔"

"ہیلو مس! اگر عزت اور تمیز کا تعین آپ اور تم جیسے الفاظ سے کیا جاسکتا تو وہ ناپی جانے والی کوئی شے ہوتی… میں آپ کی کتنی عزت کرتا ہوں، یہ میں جانتا ہوں اور میرا اللہ! میں نے آج تک کسی دوست کو بھی تم کہہ [illegible] یا دشمن کو کہتا ہوں یا پھر اسے جسے [illegible] بن جاتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر واقعی جان پہ بن جاتی ہے۔" زین نے بات سختی سے شروع کی، لیکن [illegible] کرتے کرتے اس کا لہجہ نرم پڑ گیا اور [illegible] تم ہوا۔ زارا نے دیکھا، اس کے بائیں [illegible] مچل پڑا۔ اس نے نظریں چرائیں۔ وہ پتھر کی مورت نہیں بننا چاہتی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے، تم کیا کررہے ہو؟" اس سے میری عزت پر کتنی انگلیاں اٹھ سکتی ہیں؟ میں گھر سے ایک مقصد لے کر نکلی ہوں اور وہ مقصد یقیناً" کسی لڑکے کو پھانسنا نہیں ہے۔ تم جسے عزت کہہ رہے ہو وہ ہوس ہے۔ صرف چار دن کی کشش! آج میں تمہیں اچھی لگ رہی ہوں، کل کو کوئی اور لگ جائے گی۔ تمہارے لیے یہ تماشا ہے اور میرے لیے عزت کا سودا! جان سے جاؤں گی، مگر عزت نہیں گنواؤں گی؟ زارا نے اس کے ساتھ خود کو بھی باور کروایا۔

"یہ کام آپ کی عزت پہ حرف لانے کے لیے نہیں کیا، بلکہ آپ کو مس سے مسز بنانے کے لیے کیا ہے… وقت شاہد ہے کہ میں اپنا ارادہ باندھ چکا ہوں… مجھے اپنی نیت پر اعتماد ہے اور جہاں تک بات رہی ہوس کی آئندہ میرے سامنے اس گندے لفظ کو استعمال نہیں کرنا۔" زین کا رد عمل انتہائی سخت تھا۔ اسے واقعی غصہ آگیا تھا اور یہ غصہ اس کے چہرے کے تاثرات پر پڑھا جاسکتا تھا۔ وہ کہہ کر رکا نہیں اور کلاس میں چلا گیا۔

"عمر دیکھو اور کرتوت دیکھو… ہر پندرہ سال کا لڑکا عاشق بنا پھر رہا ہے۔ چلو سترہ سال کا ہوگا۔ اسی وجہ سے مائیں گھروں میں راہ تکتی رہ جاتی ہیں اور یہ مجنوں سڑکیں ناپتے رہتے ہیں۔ یہی عمر اگر پڑھائی میں صرف کریں تو کل کو اچھا مستقبل اور ایک سے ایک حسین لڑکی ان کے پیچھے چلتی نظر آئے۔ میرا لفظ گندا ہے اور اس کا کام صحیح ہے۔ واہ! بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت گلے پڑ گئی ہے؟ شکل موموناں کرتوت کافراں!" زارا خود کلامی کرتے اور بے دھیانی میں اپنی لونگ کو انگلیوں سے گھماتی اسٹاف روم کی طرف بڑھ گئی۔

کہیں دور پرندوں نے آپس میں چونچیں لڑائیں اور فضا ان کی چہچہاہٹ سے نغمگیں ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

کمرے کے اندھیرے میں خاموشی رقص کررہی تھی اور اندھیرے سے لڑنے کو ایک اکلوتا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ وہ ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔ دونوں ماں بیٹی اپنے اپنے بستر میں لیٹی ایک دوسرے کو سوتا ہوا سمجھ رہی تھیں۔ دفعتاً" ثمینہ کو کھانسی ہوئی۔ زارا جو ٹمٹماتی روشنی میں ہاتھ کے سائے سے مختلف شکلیں بنا رہی تھی۔ فوراً" اٹھ بیٹھی۔

"اماں پانی دوں؟"

"نہیں، ضرورت نہیں ہے۔ آدھی رات کو پانی پی کر واش روم ہی بھاگتی رہوں گی۔ خود ہی ٹھیک ہوجائے گی کھانسی!" ثمینہ نے بہت سکون سے کہا۔

"اماں، ابا کیسے تھے؟" زارا کو اپنے والدین کے بارے میں ہر بات پتا تھی۔ ثمینہ نے اس سے کبھی کچھ نہ چھپایا۔ شاید غربت خود اتنا بڑا دکھ ہوتی ہے کہ کوئی اور دکھ، دکھ ہی نہیں لگتا۔ غربت کے سامنے سارے دکھ خود ہی ننگے ہوجاتے ہیں۔ زارا بڑے آرام سے اعجاز کو ابا کہتی اور رحیم کو بابا کہہ کر پکارتی۔

"تمہارے ابا ویسے تھے جیسا ہونے کی لوگ خواہش لوگ کرتے ہیں۔ بے غرض، بے لوث بہت پیار کرنے والے اللہ تعالیٰ کے سچے بندے!" ثمینہ کی آنکھوں کی روشنی کمرے میں موجود روشنی سے کچھ زیادہ بڑھی۔

"ابا آسانی سے مرگئے ہوں گے؟ انہیں تو بہت تکلیف ہوئی ہوگی کہ وہ آپ کو اور مجھے اکیلا چھوڑ کر جارہے ہیں۔" زارا نے ماں کی آنکھوں کی جوت کو دیکھتے تجسس سے پوچھا۔

"اللہ نہ کرے بالکل وہ بھلا کیوں اذیت سے مرنے لگے؟ اور کس نے کہا ہے کہ وہ ہمیں اکیلا چھوڑ گئے ہیں؟" ثمینہ نے سر اٹھا کر نیچے ہاتھ رکھا اور اٹھے ہوئے سر کے ساتھ زارا کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"یعنی ابا کے گھر والے پہلے اچھے تھے؟ ابا کی موت کے بعد انہوں نے رنگ بدلے۔" زارا نے اپنی سوچ کی تائید چاہی۔

"ان کے گھر میں تھا ہی کون… ایک سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائی۔ وہ شروع سے اس شادی کے حق میں

ہی نہیں تھے اور تمہاری پیدائش پر بھی بہت شور و غل کیا، لیکن اعجاز کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ وہ تمہیں دیکھ کر جیتے تھے۔" ثمینہ نے اس کی سوچ کو جھٹلایا، پھر سنہری یادوں میں کھو گئی۔ فرار کتنا بہترین راستہ ہے۔

"ابھی تو آپ نے کہا کہ انہوں نے ہمیں اکیلا نہیں چھوڑا۔" زارا تقریباً" اٹھ کر بیٹھ گئی تھی، پھر کس کے سہارے چھوڑ گئے ہمیں؟"

"اللہ کے سہارے... ہم کہاں اکیلے ہیں؟ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" ثمینہ نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

"اماں اللہ کہاں ساتھ ہے؟" اس نے اس بھیڑ چال کی دنیا میں ہمیں دھکیل دیا ہے اور اب دیکھ رہا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں کہاں ٹھوکر کھاتے ہیں کہاں سے سبق سیکھتے ہیں۔" زارا نے مایوسی سے جواب دیا۔

"ارے نعوذ باللہ... کیسی باتیں کرتی ہو، یہ دنیا بھی اللہ کی اجازت سے چل رہا ہے۔ اگر نہ چلے تو کہاں جاؤ گی؟ لاکھ برے سہی لیکن پیچھے رہنے والے ہمارے اپنے ہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوں تو بھری دنیا میں کہاں جاؤ گی؟" وہ چاہتا تو تمہیں نوکری نہ دیتا؟ تمہاری سانس روک دیتا۔ تمہیں مرض لاعلاج میں مبتلا کر دیتا ہم کھانا کھا لیتیں، لیکن وہ کھانے کا ہضم ہونے کی اجازت نہ دیتا، تم سونا چاہتیں، لیکن وہ آنکھ کے پپوٹے بند ہونے سے روک لیتا، بے شک ہمیں لگتا ہے دنیا میں کچھ لوگ ہمارے ساتھ ہیں، ہمارے اپنے ہیں، لیکن وہ فقط وسیلہ ہیں اور وسیلہ بھیجنے والی ذات اللہ کی ہے۔ اب سو جاؤ، ورنہ صبح اسکول کے لیے آنکھ نہیں کھلے گی۔" ثمینہ نے بات سمیٹی۔

☼ ☼ ☼

وہ دن عام دنوں جیسا تھا، لیکن شاید اللہ کی طرف سے بدگمانیوں کے بادلوں کو چھٹنے کا حکم ملا تھا۔ تب ہی فریحہ خود زارا کے پاس آئی اور اپنے رویے کی معافی مانگی۔

"احساس تو مجھے اسی دن گھر جا کر ہو گیا تھا، لیکن معافی مانگنا کافی مشکل لگا۔ معافی مانگنا مجھے ہی نہیں سب کو ہی مشکل لگتا ہے۔ سچ کہوں تو ہمیشہ اسی فکر میں لوگوں کو غلط کرتے اور اس پر جمے رہتے دیکھا ہے کہ معافی کیسے مانگیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے اسلامیات کے ٹیچرز عقیدہ آخرت کی اتنی اچھی تشریح نہیں کرتے۔ میری اسلامیات کی ٹیچر بہت اچھی تھیں۔ میم ارجمند ہمیں کہتی تھیں کہ یہ دنیا صرف عمل کا میدان ہے، رد عمل تو ہمیں یوم آخرت ملے گا... جو ادھر کر رہے ہو وہ حرف آخر نہیں ہے، وہ تو صرف ہوا کے دوش پر بھیجی جانے والی آواز ہے، جو روز قیامت گونجے گی تو تم اپنے ہی لفظوں کے چناؤ پر پریشان ہو جاؤ گے... اس دنیا میں زارا سب تمہارے سامنے ہے۔ دیکھو لوگ کتنا برا کرتے ہیں، پھر اسی دنیا میں دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کے قدموں کا تکبر دیکھ کر دل دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ یہ عقیدہ آخرت ہی ہے، جو تسلی ہے، اطمینان ہے کہ پریشان نہ ہو۔ وہ سب حساب لے گا۔ یہ عقیدت آخرت ہی ہے، جو کہتا ہے جا کر بندوں سے معافی مانگ لو، ورنہ بندوں پہ ہوئے ظلم کا اللہ خود بدلہ لے گا۔ تمہارے پاس معافی مانگنے آنے کا جب سوچتی ایک عجیب سی شرمندگی سے دوچار ہو جاتی۔ پھر سوچا کہ تم نے تو کبھی کچھ برا بھی نہیں کہا کہ میں بدلے والی کیٹگری میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاتی۔ اس لیے تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے روز قیامت سے ڈر لگتا ہے۔"

وہ باتونی سی لڑکی بولنے پہ آئی تو بے حد معصوم لگ رہی تھی۔ زارا نے اس کے آگے بڑھے ہاتھوں کو تھام لیا اور گلے سے لگا لیا۔ اندر کہیں ڈرنے بھی پوری شدت سے سر اٹھایا تھا۔ اماں کہتی ہیں وسیلے اللہ بناتا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ عاقب کے سلسلے میں زین اس کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ زارا، فریحہ کو گلے لگائے ابھی یہی سوچ رہی تھی۔ وجہ واضح تھی کہ ساتواں پیریڈ چل رہا تھا۔ آٹھویں کے بعد چھٹی ہوتی اور پھر وہی سنسان گلیوں میں پیچھے آتے قدموں کی چاپ... آٹھواں پیریڈ زارا کا بھی کلاس میں ہی تھا۔ لیکچر دے کر بچوں کو مصروف کیا اور زین کو بلایا۔

"زین بات سنو بچے!" زین کی آنکھوں میں حیرت اور ناگواری ایک ساتھ در آئی۔ وہ کلاس کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ زین ساتھ سے گزر کر باہر کی طرف کھڑا ہو گیا۔ ساتھ سے گزرتے ہوئے وہ ناک کی لونگ کو ایک نظر دیکھنا نہ بھولا۔

"آپ کو کہا ہے مجھے بیٹا یا بچے نہ کہا کریں۔" زین نے اس کے بولنے کا انتظار نہیں کیا۔

"ہو تو چھوٹے ہی نا اب کیا کر سکتی ہوں۔" زارا کو اپنی سوچ پر شک ہوا۔ اس کو بلانا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔

"مرد چھوٹے بھی ہوں تو بڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔ زارا نے اس کی گردن کے ابھار کو انجانے میں دیکھا اور سٹپٹا کر نظر ہٹالی۔

"زین میں بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہمارے گھر میں عزت کے علاوہ کوئی دوسری قیمتی شے نہیں۔ میری بہت لاچار سی ماں نے صرف میری پڑھائی کے لیے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر ظاہر کیا ہے۔ یہ نوکری میری مجبوری ہے۔" وہ سر جھکائے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں کلائی کو کھینچے چلی جا رہی تھی۔

"اس طرح کی ڈھکی چھپی باتیں آپ مجھے بتا چکی ہیں اور باقی میں نے خود جان لی ہیں۔ آپ کو دوبارہ ایک بھی بات دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے آپ کو کسی قسم کی شکایت دوبارہ نہیں ہو گی، لیکن میں اپنی خواہش سے دست بردار نہ ہوا ہوں اور نہ ہی ہو سکتا ہوں۔ اردگرد کے لوگوں کو بھنک بھی نہیں پڑے گی اور پروانہ جلتا رہے گا۔" زین لفظ آپ پر زور ڈالتا ہوا شوخ ہوا۔ زارا کو پھر سے کوفت ہوئی۔ زین اب اندر جانے لگا۔ زارا نے دل پر حوصلے کا ہاتھ رکھا اور بولی۔

"سنو..."

"جی سنائیں، سن رہا ہوں۔" زین، زارا کے کمر تک آتے بالوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"عاقب واپسی پہ روز مجھے گھر چھوڑتا ہے۔" شاید اس سے بہتر لفظ زارا کو نہیں ملے۔

"واٹ ڈیو یو مین؟ آر یو سیریس؟" زین کا چہرہ لمحے میں سرخ ہوا۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔

"نہیں مذاق کر رہی ہوں۔" زارا نے جل بھن کر کہا اور کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"آج سے میں آپ کو چھوڑنے جاؤں گا۔ بے فکر رہیں، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔" زارا کو پیچھے سے آواز آئی۔ وہ انہی پاؤں پر مڑی تھی کہ شاید نادیدہ کلہاڑی اپنے ہاتھوں، اپنے پاؤں پر ماری ہے۔ ایک کی جگہ دو چھوڑنے جائیں گے۔

"تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ میں نے غلطی کی ہے؟" وہ بولتے ہوئی براہ راست شہد رنگ آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"میں نے کہا کسی کو پتا نہیں چلے گا اور یہ تمہاری غلطی نہیں۔ یہ تمہارا تیسرا احسان ہے مجھ پر۔" وہ آہستہ سے کہہ کر بہت قریب سے گزرا۔ زارا اب کچھ مطمئن اور کچھ پریشان ہو گئی۔ احسانات کی فہرست جان کر وہ اپنے آپ کو اس کے قریب نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ پتا نہیں زندگی کون سا موسم لیے، میری منتظر ہے۔ کب دکان کی چھت تعمیر ہو گی، کب میں اس قفس سے آزاد ہوں گی، یہ نوکری اب اس کے لیے امتحان بنتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کے وقت زارا سود و زیاں کا حساب لگانے میں مگن تھی کہ اس کا لنچ باکس کلاس میں ہی رہ گیا، گو کہ وہ چھوٹی بچی نہیں تھی، لیکن امی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کا صبح صبح انکار کیسے کرتی؟ چپ چاپ ساتھ لے آتی، کھا لیتی، واپس گھر جا کر دن کا کھانا ویسے بھی تھکاوٹ کے باعث یا تو نہ کھاتی یا بہت کم کھاتی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر جا رہی تھی۔ اپنی گلی میں داخل ہوئی تو پیچھے سے آواز آئی۔

"میم!" وہ پورے جی جان سے کانپی۔ زین کا یوں آجانا اس کے لیے کوئی مسئلہ بنا سکتا تھا۔

"یہ آپ کا کیچ باکس رہ گیا تھا' میں نے سوچا پکڑا دوں۔" زین کہہ رہا تھا اور وہ اس کی عقل پہ ماتم کر رہی تھی کوئی دیکھ لے تو۔۔۔ اس نے فوراً" سے پیچ باکس پکڑا اور گھر کے اندر گھس آئی۔ اس کے خیال میں اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہی اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ دن کو وہ تو سو گئی' لیکن شام کو بدنصیبی جاگ گئی۔ شام سے نیچے شور برپا تھا۔

"ثمینہ او ثمینہ۔۔۔ نیچے آ۔" کشور بیگم یوں دھاڑ رہی تھی جیسے آج پہلا اور آخری موقع ملا ہو۔ "یہ آئی تو میں نے کہا تھا یہ نیچ ہے۔ آج اس کی تربیت نے رنگ دکھا دیا۔ آج اس نے اپنا آپ دکھا دیا۔" کشور بیگم ہاتھ اٹھا اٹھا کر چلا رہی تھی۔ ثمینہ تقریباً" بھاگتی ہوئی نیچے اتری تھی۔ زارا نے ساتھ جانا چاہا تو ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"زارا سے پوچھو آج ساتھ کون آیا تھا۔" سلیم نے ثمینہ کی طرف نگاہ کیے بغیر پوچھا۔ اسے کشور بیگم جتنا اشتعال نہیں تھا' اسی بات کا غصہ کشور بیگم کو آیا۔

"آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا میں دیکھتی' آپ کیسے اتنے آرام سے یہ سوال پوچھتے ہیں۔ ارے وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا' پھر اس کو روکا' کچھ دیا اور چلا گیا۔ میرے گھٹنوں میں درد نہ تو اماں اصغری کے گھر سے بھاگ کر نکلتی اور رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی' جب تک میں گھر آئی وہ اپنے ڈربے میں چلی گئی تھی۔" کشور بیگم کا غصہ سانپ کی طرح پھنکار تا رہا۔

"میری زارا ایسا ویسا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں اس سے پوچھتی ہوں ضرور کوئی اور بات ہو گی۔" ثمینہ آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ کشور بیگم کے تیور کھڑا ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

"کوئی اور بات کیا بات ہو گی؟ اتنا اونچا لمبا لڑکا تھا۔ میں نے کہا تھا سلیم یہ ماں' بیٹیاں ضرور کوئی گل کھلائیں گی۔ انہیں اسی دن گھر سے نکال دیتے۔ رحیم خود تو چلا گیا' ہمارے سر پر یہ عذاب مسلط کر گیا۔ تم لوگوں کی باتوں سے ڈرتے تھے۔ اب جو لوگ باتیں بنائیں گے' وہ کیسے سنو گے؟" کشور بیگم' سلیم کے گلے پڑیں۔

"کشور خدا کا خوف کرو۔۔۔ میری بیٹی پہ بہتان نہ باندھو۔ اللہ کے غضب سے بچو۔" ثمینہ کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے لگا وہ مر رہی ہے۔

"میں اللہ کے خوف سے بچوں۔ تم نہ بچنا' تمہاری بیٹی نہ بچے۔ پتا نہیں کس کی اولاد ہے۔ کہاں سے اٹھا کر لائی ہو۔ جائز بھی ہے یا نہیں؟ ایسے کرتوت جائز اولاد کے تو نہیں ہو سکتے۔ بلاؤ اپنی بیٹی کو' ہے اس کے پاس کوئی جواب؟" کشور گلا پھاڑ کر الزام لگانے لگی۔ زارا دوڑتی ہوئی اوپر سے نیچے آئی۔

"میں بتاتی ہوں۔ وہ کون تھا آپ جو سمجھ رہی ہیں۔" وہ بتانا چاہتی تھی' لیکن یہ اس کی ماں تھی جو سامنے آگئی۔

"زارا تو کچھ نہیں بولے گی۔۔۔ واپس اوپر جا۔"

"اماں وہ الزام لگا رہی ہیں مجھے بتانے دیں' مجھے بولنے دیں۔" زارا نے آگے بڑھنا چاہا۔

"ہاں اپنے منہ سے اپنی آوارگی کی داستان سنا۔ تیری ماں نے تو کبھی نہیں سنائی۔ تو سنا دے۔" کشور بیگم چیخ چیخ کر زارا کو للکارتی رہی۔ زارا حیران تھی' پریشان تھی۔ اسے اتنی تکلیف کشور کے لفظوں سے نہیں ہوئی تھی' جتنی ماں کے عمل سے ہو رہی تھی۔ ماں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

"تو نے ایک لفظ نہیں بولنا۔ تو نے کچھ نہیں بتانا۔ یہ عورت اس وقت گندگی پھیلانے پہ آئی ہے۔ اس کا منہ بند کروانے کے لیے تو اپنا منہ کھولے گی تو گندی ہو جائے گی۔" ثمینہ کے لفظوں اور آنکھوں میں التجا تھی۔ زارا اپنی ماں کے منہ سے پہلی دفعہ ایسے سخت الفاظ سن کر حیران ہو گئی۔

"ہم گند ہیں' ہم گندگی ہیں۔ ارے ہم جدی پشتی سید ہیں' تمہاری طرح نہیں۔ باہر جو راہ گیر ملے اس کے ساتھ چل پڑیں۔۔۔ تو ہے کون؟ تیرے جیسی منحوس عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ ایک شوہر کو مار کر آئی۔ دوسرے کے گھر قدم رکھا' ناگن اسے بھی کھا گئی۔" کشور کے اندر کا زہر ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"آپ میری اماں کو کچھ مت کہیں۔" ثمینہ صرف کھانس رہی تھی۔ مسلسل کھانسی کا دورہ اور الزامات اسے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے' لیکن زارا کے کہنے کی دیر تھی۔ ثمینہ نے کھینچ کر زارا کے منہ پر تھپڑ مارا۔

"میں نے تجھے کیا کہا ہے۔ تو چپ رہ۔ پھر کیوں بول رہی ہے۔" کھانسی کے ساتھ بس وہ یہی کہہ سکی۔

"لو جی اماں' بیٹی کا اپنا ڈراما شروع ہو گیا۔ سلیم تو کچھ نہ کر۔۔۔ تو نے ساری زندگی کچھ نہیں کیا۔" کشور اپنے شوہر کے ساتھ بھی وہی زبان بول رہی تھی جو اس سے پہلے ثمینہ سے بول رہی تھی۔ زارا کچھ بولنے کو بے چین تھی' لیکن ثمینہ کی بگڑتی حالت دیکھ کر چپ کھڑی تھی۔ زمانے کی ساری سختیاں ایک طرف اور ماں کا غصے سے مارا گیا تھپڑ ایک طرف۔

"اب بس کرو تماشا۔۔۔ زارا کل سے اسکول نہیں جائے گی۔" سلیم کو اپنی مردانگی دکھانے کو ثمینہ اور زارا ہی ملی تھیں۔ زارا اور ثمینہ روتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔ ثمینہ نے فوراً" دوا لی۔ زارا اماں سے خفا تھی۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور ثمینہ اپنے بستر پر۔

"میری کیا غلطی ہے؟"

میں عورت ہوں۔

میرا عورت ہونا جرم ہے۔

عاقب میرا پیچھا کر سکتا ہے' وہ مرد ہے۔

میرا چچا مجھ پر پابندی لگا سکتا ہے' وہ مرد ہے۔

زین مجھ سے اپنی نام نہاد محبت کا اظہار کر سکتا ہے' وہ مرد ہے۔

لیکن مجھے ہر جگہ خاموش رہنا ہے۔

کیونکہ میں عورت ہوں اور پھر زارا زندگی کے دیے اسباق سسکیوں سے دہراتے دہراتے سو گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کا ہی کوئی پہر تھا زارا کو ایک سایہ خود پہ جھکا محسوس ہوا۔ وہ چونک کر اٹھی۔ زیرو بلب کی روشنی میں ماں کا وجود اسے سایہ ہی لگا۔ ثمینہ کی کھانسی مسلسل جاری تھی' جیسے کوئی عذاب ہو۔

"اماں ہٹو۔ میں کسی کو دیکھتی ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" شام کا سارا واقعہ دماغ سے محو ہو گیا۔ نیند بھی کیا شے ہے۔ یہ نرا نشہ ہے۔ غم بھلا دیتی ہے۔

"نہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں' تو میری بات سن لے' جو تیرے لیے سننا ضروری ہے۔" تکلیف کے آثار ثمینہ کے چہرے پر تھے۔ زارا نے اسے خاموش کروانا چاہا' لیکن وہ زارا کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ "تیرے ابا کہا کرتے تھے' میری بیٹی جب تک سر جھکائے گی امان پائے گی۔ جب سر اٹھائے گی' پریشان ہو جائے گی۔ اللہ کے کام ہم انسانوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ہم جسے اچھا سمجھتے ہیں' اسی میں برائی ہوتی ہے اور جسے برا سمجھتے ہیں اسی میں اچھائی ہوتی ہے۔ اللہ کے نزدیک سب بندے ایک جیسے ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ وجہ ان کے اعمال ہیں۔ کوئی مقرب ہے تو کوئی خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہوا۔ کچھ کو اللہ سر جھکانے پہ دیتا ہے اور کچھ کو اللہ غلطیوں پہ بھی نواز کر واپس اپنے رستے پر بلاتا ہے۔ تم ایک کام کرنا کہ میری زارا کو سر جھکانا سکھانا۔ سر اٹھانا آسان ہے' جھکانا مشکل ہے۔ جو سر جھکانا سیکھ جاتا ہے وہی سربلند ہوتا ہے۔ تم اپنے سر کو جھکا لو۔ اللہ کی رضا میں راضی ہو جاؤ۔" ثمینہ نے بمشکل اپنی بات تمام کی اور پھر کھانسی کا دورہ آیا۔ زارا جیسے کسی خواب سے چونکی' ثمینہ کے منہ سے کھانستے کھانستے خون بہنے لگا۔ زارا کے ہاتھ پہ ایک لکیر سی ٹھہر گئی۔

"اماں۔۔۔ اماں۔۔۔" وہ ماں کو پکار رہی تھی۔ ایک انجانے سے ڈر نے اس کے دل کو جیسے مٹھی میں لے لیا۔ بالکل نا آشنا سی آہیں بلند ہونے لگیں۔

"مجھے چھوڑ دو زارا۔۔۔ آب زم زم پلا دو۔" ثمینہ نے الماری میں پڑی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

"اماں۔۔۔ اماں۔۔۔ سیدھی بیٹھیں، میں ابھی بلقیس آنٹی کے گھر سے کسی کو بلا کر لاتی ہوں۔" زارا آب زم زم پلا کر دوڑتی ہوئی گئی۔

مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔ کی آوازیں آنے لگی۔ ایسی طلسمی آوازیں کے نیچے زمین پہ ٹکنے سے انکاری تھے۔ کسی کے پاؤں بخ ہوئے اور پھر پنڈلیاں۔۔۔ فجر کا وقت ہو چلا تھا۔ پرندے تسبیح کرنے جاگ گئے تھے۔ اب انہیں رزق تلاشنا تھا۔ کون سا پرندہ واپس لوٹے گا اور کون سا نہیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب زارا بلقیس آنٹی کو لے کر گھر آئی تو ماں کا اس دنیا میں رزق ختم دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔

زارا نے مارے صدمے کے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ابھی تو سب کچھ ٹھیک تھا، زندگی مشکل ضرور تھی لیکن ماں ساتھ تھی، ہنستی بولتی تھی۔ اس کے پاس کیا تھا؟ اس زندگی نے کیا دیا تھا؟ صرف ایک ماں۔۔۔ لیکن آج محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک ماں ہر دکھ کے سامنے ڈھال تھی۔ ہر مرض کی دوا تھی۔ اگر اسے ایک ماں ملی تھی تو ایسی ملی تھی کہ زندگی سے جڑی باقی حسرتیں طمانیت کے خول میں لپٹی رہتی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کے ساتھ اپنے صدمے میں ڈوبے چہرے کو آسمان کی جانب اٹھایا۔ وہ شکوہ کرنا چاہتی تھی، لیکن اللہ سے ڈر لگتا تھا۔ سارا صدمہ اور سارا افسوس اس کے اندر بیٹھ گیا۔ ڈر سب جذبوں پہ کنڈلی مار کر بیٹھا رہا۔ بلقیس آنٹی اسے رلانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بیٹا رو لو۔۔ جانے والے کے ساتھ جایا نہیں جا سکتا۔" لیکن وہ خاموش تھی۔ اس کے رونے سے کون سا ماں نے اٹھ جانا ہے۔ ایسے کیسے چھوڑ گئی مجھے؟ کس کے سہارے پر چھوڑ کر گئی ہے۔ سوالات کی برچھیاں تھیں جو سینہ چھلنی کر رہی تھیں، لیکن ایک لفظ حلق سے بھی نہیں نکل رہا تھا۔ چارپائی کب نیچے صحن میں لا کر رکھی گئی۔ کب اسے کسی نے ماں کے پاس بٹھایا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ ساتھ والی مسجد میں جنازے کا اعلان ہوتا رہا۔ اسکول کا سارا عملہ آیا اور زارا سے افسوس کر کے چلا گیا۔ زارا کے پاس رونے کو ایک قطرہ بھی آنسو کا نہ تھا۔ چارپائی اٹھانے کچھ لوگ اندر آئے، ان میں وہ بھی تھا۔ زارا اٹھی اور اس پر جھپٹ پڑی۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں۔۔۔ میری ماں کو مار کر چین نہیں ملا جو اسے دفنانے بھی آ گئے ہو۔" اس کے خیال میں وہی مجرم تھا۔ زین ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"میم آپ۔۔۔"

"بند کرو یہ تماشا۔۔۔ وہی الفاظ استعمال کرو جو اکیلے میں کرتے ہو۔ ایک تمہاری ہی وجہ سے کشور چچی نے میری ماں کے کردار پر انگلی اٹھائی اور میری ماں سہہ نہ سکی۔ تمہارے جذبات نے کیا دیا مجھے؟ میری ماں کی موت؟ تم آئے ہی کیوں میری زندگی میں؟ میں نے بلایا تھا تمہیں؟ میرے کس عمل نے تمہیں شہہ دی کہ تم میری زندگی برباد کرنے آ گئے۔ کیوں آئے ہو تم زین یہاں میرا تماشا بنانے۔" وہ زخمی شیرنی کی طرح دھاڑتے ہوئے سسکنے لگی۔

"اگر میں یہاں تماشا بنانے آیا ہوں تو واللہ لوگ دیکھیں گے کہ ایک دن میرا بھی تماشا بنے گا۔۔۔ اور اگر میں یہاں آپ کی عزت پر انگلیاں اٹھوانے آیا ہوں تو واللہ لوگ دیکھیں گے کہ ایک روز میں بھی ذلیل ہوں گا۔۔۔ لیکن زارا اگر مجھے تمہارا ساتھ دینے کی خواہش یہاں گھسیٹ کے لائی ہے تو تم بھی ایک روز ضرور میرا ساتھ مانگو گی۔ اگر میرے دل میں تمہیں عزت دینے کی خواہش ہے تو یاد رکھنا زارا کا نام زین کے ساتھ کے لیے تڑپے گا۔ اقرار سننا چاہتی ہو؟ میں سب کے سامنے اقرار کرتا ہوں ہاں! میں زین عباس زارا رحیم سے پیار کرتا ہوں۔ ہاں! میں زین عباس زارا رحیم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور میں سب کے سامنے وعدہ کرتا ہوں، اگر زندگی نے وفا کی تو میں اپنے لفظوں کی لاج ضرور رکھوں گا۔" اتنا کہہ کر اس نے بلند آواز میں [illegible]۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگوں نے ساتھ مل کر چارپائی اٹھائی۔

"یہی کرتوت تھے اس کے۔۔۔ اسی لیے ماں مر گئی! اس نے ماں کی میت کو بھی نہ دیکھا اور پھر چار لوگوں میں تماشا بنا لیا۔ اس کے گلے ہی پڑ گئی!" کشور بیگم ایک دفعہ پھر جلال میں آئی۔ محلے کی عورتوں نے اسے گھسیٹا اور کمرے میں لے گئیں۔ بلقیس بیگم نے ٹھنڈی زارا کو سینے سے لگا لیا۔ اس کا اٹھا ہوا سر کاتب تقدیر نے بہت غور سے دیکھا۔

شاید کہیں سے کوئی آزمائش راستے کی رکاوٹیں عبور کرتی آ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

محبت

فرض کرو ہم اہل وفا ہوں، فرض کرو دیوانے ہوں
فرض کرو یہ دونوں باتیں، جھوٹی ہوں افسانے ہوں

فرض کرو یہ جی کی بپتا، جی سے جوڑ سنائی ہو
فرض کرو ابھی اور ہو اتنی، آدھی ہم نے چھپائی ہو

فرض کرو تمہیں خوش کرنے کے ڈھونڈے ہم نے بہانے ہوں
فرض کرو یہ نین تمہارے سچ مچ کے میخانے ہوں

فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا، جھوٹی پیت ہماری ہو
فرض کرو اس پیت کے روگ میں سانس بھی ہم پہ بھاری ہو

فرض کرو یہ جوگ بجوگ ہم نے ڈھونگ رچایا ہو
فرض کرو بس یہی حقیقت باقی سب کچھ مایا ہو

دیکھ مری جاں کہہ گئے باہو، کون دلوں کی جانے، ہو
بستی بستی صحرا صحرا، لاکھوں کریں دوانے ہو

جوگی بھی جو نگر نگر میں مارے مارے پھرتے ہیں
کاسہ لیے بھبوت رمائے سب کے دوارے پھرتے ہیں

شاعر بھی جو میٹھی بانی بول کہ من کو ہرتے ہیں
بنجارے جو اونچے داموں جی کے سودے کرتے ہیں

ان میں سچے موتی بھی ہیں ان میں کنکر پتھر بھی
ان میں اتھلے پانی بھی ہیں، ان میں گہرے ساگر بھی

گوری دیکھ کے آگے بڑھنا سب کا جھوٹا سچا ہو
ڈوبنے والی ڈوب گئی وہ گھڑا تھا جس کا کچا ہو

تیرے رنگوں سے توبہ! زندگی کے بھی کیا رنگ ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتا ہے، رواں دواں ہوتا ہے لیکن اچانک یوں کایا پلٹی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ افتاد پڑتی ہے اور سانس لینا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ زندگی ہی تو ہے جو انسان کو تخت و تختہ ایک ہی انچ کے فاصلے سے دکھاتی ہے۔ شاہ کو گدا بنا دیتی ہے۔ جینے والوں کو پلک جھپکتے میں قبر میں پہنچا دیتی ہے۔ ابھی سب ٹھیک تھا۔ ایک دکان کی چھت کا ہی مسئلہ تھا۔ ماں تو زندہ تھی، لیکن وہ چھت یہیں رہ گئی اور ماں چلی گئی۔ اللہ کو یہ امتحانات لینا کیوں مقصود تھا؟ تو رب کائنات ہے! ہماری صلاحیت کو جانتے ہوئے کیوں نتیجہ اخذ نہیں کر لیتا؟ اس خاردار میدان میں کیوں ہمیں چھلنی ہونے کو بھیجا ہے؟ وہ سوال کرنا چاہتی تھی، لیکن ڈر کی تمام جڑیں اس کے اندر تک پیوست تھیں۔

"تمہیں کیا واقعی نہیں پتا تھا؟" بلقیس زارا کو ٹٹولنے لگیں۔

"کیا؟" زارا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہی کہ تمہاری ماں کو ٹی بی تھی۔" بلقیس آنٹی نے انکشاف کیا۔ زارا کی بڑی بڑی آنکھیں مارے حیرت کے کچھ اور کھل گئی۔ "اس نے کہا تھا کہ تمہیں پتا ہے اور علاج بھی ہو رہا ہے۔"

"نہیں ایسا تو نہیں ہے امی صرف کھانسی کی دوائی لیتی تھیں۔" زارا نے بتایا اور بتاتے ہوئے اسے اپنے ہی لفظوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اپنا آپ کتنا تہی دامن لگنے لگتا ہے جب آپ کا کوئی بہت اپنا آپ سے کوئی بات چھپا لے۔ جب آپ کو وہی بات کسی اور

سے پتا لگے اور ایسے وقت میں پتا لگے کہ آپ اس اپنے سے شکوہ بھی نہ کرسکتے ہو۔

"امی مجھے بتا دیتیں میں آپ کو جی بھر کر دیکھ تو لیتی۔۔۔ آپ کو ایک دفعہ بھینچ لیتی۔ آپ کو اتنا پیار کرتی کہ آپ اس دنیا سے نہ جاتیں۔" وہ باآواز بلند خود کلامی کرتی رہی۔

"دیکھو ثمینہ کو تمہارے گلے شکووں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمہاری دعاؤں کی ضروری ہے اور تمہارا پیار بھی اسے اس دنیا میں روک نہیں سکتا تھا' تاوقتیکہ اللہ کا حکم نہ ہوتا۔" بلقیس آنٹی زارا کو سمجھانے لگی۔

ڈرنے پوری قوت سے سر اٹھایا۔

"تم وضو کرو اور ثمینہ کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھو۔"

"بلقیس آنٹی ابھی مجھ سے کچھ پڑھا نہیں جائے گا اور اللہ جی کو اچھا نہیں لگے گا۔۔۔ کوئی غلطی ہوگئی تو ثواب کے بجائے الٹا گناہ ہوگا۔۔۔ مجھے اللہ سے آج زندگی میں سب سے زیادہ ڈر لگا ہے۔ وہ چھیننے پر قادر ہے۔" زارا فق چہرہ لیے بڑبڑاتی رہی۔

"ہیں۔۔۔ ہیں؟ پاگل ہوگئی ہو؟ اللہ سے ڈرتی ہو؟ وہ سوہنا تو محبت کرنے کے لیے ہے۔ اللہ سے محبت کرو۔" بلقیس کو اس کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا۔

"اللہ سے محبت؟ وہ کیسے کرتے ہیں؟ اللہ سے تو ڈرنا چاہیے' جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے' تاکہ اس کے احکامات کی تعمیل کی جاسکے۔" زارا حیران ہوئی۔

"اللہ سے محبت بالکل ویسے ہی جیسے اپنے والدین سے کرتے ہیں اپنے دوستوں سے کرتے ہیں' ان کو وقت دیتے ہیں' ان سے راز و نیاز کرتے ہیں' اپنی کہتے ہیں ان کی سنتے ہیں' لیکن بس تھوڑا سا فرق ہے۔" بلقیس سمجھاتے ہوئے رکی۔

"ہاں جی وہ فرق اس طرح کہ اللہ جی جیسے ستر ماؤں سے زیادہ چاہتے ہیں' اس طرح ان کا عذاب بھی ستر ماؤں کے غضب سے زیادہ ہوسکتا ہے۔" زارا نے دماغ کے نہاں خانوں میں گڑی ہوئی ڈر کی زنگ آلود کیل پیش کی۔

"ارے لڑکی باؤلی ہوگئی ہو کیا؟ اگر وہ اتنا غضب ناک ہوتا تو ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کیوں کرتا؟ ہمارے گناہوں کا صلہ ہمارے منہ پر کالک کی طرح نہ مل دیتا؟ ہمیں اس دنیا میں مہلت ہی کیوں دیتا' ہماری توبہ کا منتظر ہی کیوں رہتا؟ کیوں خود تک آنے کے لیے نماز' روزے' تسبیح و نوافل جیسے راستے چھوڑتا؟ کیوں اتنی چھوٹی چھوٹی تسبیحات پہ اتنا زیادہ ثواب دیتا؟ کیوں حج کے بدلے میں انسان کو سب صغیرہ گناہوں سے پاک کردیتا؟ بھلا وہ جو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے وہ بھلا کیسے ستر ماؤں کی ناراضی سے بڑھ کر ناراض ہوسکتا ہے۔" بلقیس نے بچپن میں زارا کو قرآن پڑھایا تھا' آج اس کے جدید افکار سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"تو کیا اللہ سے ڈرنا نہیں چاہیے؟" زارا حیران ہوئی۔

"کیوں نہیں ڈرنا چاہیے؟ ڈر ہی تو تقویٰ ہے اور متقی اللہ کو بہت پسند ہیں' لیکن اس ڈر کے تین مقام ہیں۔

اول ڈرنا۔۔۔ اس ڈر سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان یہ احساس پیدا کرے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔۔۔ جانتی ہو زارا۔۔۔ دنیا بہت رنگین ہے۔ یہ بار بار اپنی طرف بلاتی ہے اور ہم اتنے پکے مومن تو ہیں نہیں کہ یہ یاد رکھیں کہ اللہ واقعی دیکھ رہا ہے۔ اس کے لیے ایک آسان سا حل ہے۔ ایک کاغذ پہ خوشخط سا لکھو کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور اپنے کمرے' اپنے گھر میں کسی دیوار پہ چسپاں کرلو۔۔۔ کچھ بھی غلط کام کررہی ہوگی تو سو میں سے پندرہ فیصد یقینی طور پر چھوڑ دوگی۔

دوسرا مقام ہے بچنا۔ بچنا یعنی اگر اللہ کا ڈر ہے اس کے دیکھنے کا احساس ہے تو پھر ہمیں ہر اس کام سے بچنا ہے جو اللہ تعالیٰ کو نہیں پسند۔ یہ ڈر یہ بچنا اللہ کے رعب سے نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ یہ اللہ سے محبت کی وجہ سے ہونا چاہیے۔ ڈر جب تابع کرتا ہے تو دماغ تاویلیں ڈھونڈتا ہے محبت جب تابعدار بناتی ہے تو دل بھی وجد میں جھک جاتا ہے۔ در حقیقت محبت جب

تابعدار کرتی ہے تو محبت' تابعداری اور تابعدار بہترین شکل میں ہوتے ہیں۔

بچنے کے بعد تیسرا مقام آتا ہے پرہیزگاری کا' جو تقویٰ کا حاصل ہے اور مقصود بھی۔۔۔ پہلے اللہ سے ڈرو پھر اس کے نزدیک ناپسندیدہ افعال سے بچنے کی کوشش کرو اور اگر کامیاب ہوگئے تو تم پرہیزگار ہو۔ ایک دفعہ پرہیزگاروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا لیا تو بیڑا پار۔" بلقیس آنٹی زارا کا سر گود میں لے کر سہلانے لگی۔

"ہم اللہ کی زیادہ محبت' زیادہ توجہ کیسے حاصل کرسکتے ہیں؟" زارا کے دل میں کسی انہونی کشش نے مدوجزر کی لہروں سا جوش مارا۔ کوئی وعدہ جاگا۔

"میں پچھلے وقتوں کی کچھ جماعتیں پاس ہوں۔ میری عقل سمجھ صفر ہے' لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اللہ کے بندوں سے اللہ کی خاطر محبت کرنے والے اللہ کو سب سے زیادہ عزیز ہوں گے۔" بلقیس آنٹی نے اسے سمجھایا۔

کوئی تھا جو بلا رہا تھا! کوئی تھا جو پکار رہا تھا۔ کوئی ابھی بھی ہے جو صدا دے رہا ہے۔ کوئی آخر تک صدائیں دیتا رہے گا۔۔۔ بلاتا رہے گا۔ زمین پر مست پیروں کی دھمک اور گھنگھروں کی آواز سے بے گانہ وہ فقیر اونچی آواز میں 'اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو' کا راگ الاپ رہا تھا! ڈر سے محبت تک کا سفر کتنا آسان ہے۔ اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔ صرف پہلا قدم اٹھانا ہے۔ اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔

☆ ☆ ☆

زارا کو اپنی اسناد لینے اسکول جانا تھا اور وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ جائے یا نہ جائے۔ زین کا سامنا کرنے کی اس میں چنداں ہمت نہیں تھی۔ جو بھی تھا اس نے واقعی بلاوجہ شدید رد عمل کا اظہار کیا تھا اور کیوں کیا تھا' یہ وہ خود بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر اپنی ساری قوتیں جمع کرکے وہ اسکول چلی ہی گئی۔ اسما نے پہلے تو افسوس کیا' پھر اسناد اس کے حوالے کیں جو اسکول کے قواعد و ضوابط کے مطابق انتظامیہ کے پاس اس کی نوکری کے تقرر کے وقت رکھی گئی تھیں۔

ساتھ ہی کچھ یاد آیا تو بولیں۔

"فزکس کے اسٹور روم میں جو نیا سامان تھا' وہ آپ ہی کے حوالے کیا تھا؟" زارا نے سر اثبات میں ہلایا۔

"میں آپ کو کہنا تو نہیں چاہتی۔ ابھی آپ صدمے میں ہیں' لیکن میں یہ بھی سمجھتی ہوں زندگی نہیں رکتی۔ اگر آپ ایک گھنٹہ میں سامان کی فہرست بنا کر مس فریحہ کے ہینڈ اوور کرجائیں تو اچھا ہوگا۔" مس اسما نے دنیا کی بات کی اور ان کو یہی کرنی تھی۔ ماں صرف زارا کی فوت ہوئی تھی۔ نقصان صرف اس کا ہوا تھا۔ زارا سر اثبات میں ہلا کر اندر جانے لگی تو اسما نے پھر بٹھا لیا۔ "بیٹا میں تو چاہوں گی آپ اپنی نوکری جاری رکھو۔ گھر میں بیٹھنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ آپ اپنے دماغ کو استعمال کرو۔ خالی بیٹھوگی تو فضول باتیں سوچوگی۔ اچھا ہے کہ خود کو مصروف کرلو۔"

"میم مسئلہ میرا نہیں ہے۔ میری فیملی کا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں نوکری کروں۔ پہلے امی مجھے سہارا دیتی تھیں۔ سب کے سامنے میری پڑھائی سے لے کر باہر نکلنے کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کرلیتی تھیں لیکن اب میں جہاں رہتی ہوں' ان کی سننی ہے۔ جو بھی ہے وہ میرا گھر ہے اور اس میں رہنے والے میری فیملی ہے۔" بولتے ہوئے زارا کو خود بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ سب بول رہی ہے کہ کشور بیگم اور سلیم انکل اس کی فیملی ہیں۔ نشا اس کی فیملی کا حصہ ہے جس نے ماں کے مرنے پہ بمشکل ایک دفعہ اسے گلے لگایا۔ کچھ حقائق دل مانے یا نہ مانے۔۔۔ کبھی جھٹلائے نہیں جاسکتے۔

اپنی ذات میں اٹھنے والی تبدیلیوں پہ تحیر آمیز تاثرات لیے وہ اسکول کے اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ شاید محبت کے بیج نے انجانے میں نمو پائی تھی۔ اسٹور روم کا راستہ اسے آتا تھا۔ ایک دل چاہا کہ کچھ پڑاؤ اسٹاف روم میں بھی ڈالے' لیکن پھر راستہ پڑاؤ پر حاوی ہوگیا۔ اس نے اسٹور روم میں قدم رکھا۔ کمرے کو قمقموں سے روشن کرنا چاہا' لیکن شاید بجلی نہیں تھی۔ عجیب ملگجا سا اندھیرا تھا۔ زارا کونے والی الماری

کے پاس گئی۔ ویسے عام دنوں میں ساتھ کوئی شاگرد ہوتا جو تھوڑا سا پاؤں اوپر اٹھا کر الماری پر پڑی الماری کے تالے کی چابی اتار دیا کرتا لیکن آج وہ اکیلی تھی۔ اس نے اوپر ہونے کی کوشش کی' لیکن الماری کے اوپر تک رسائی ممکن نہیں لگی۔ کھٹاک کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اسٹور روم کا دروازہ بند ہوچکا تھا۔

"تم؟" زارا حیران ہوئی۔

"تم نے کسی اور کو ایکسپیکٹ کرلیا تھا؟ کیسی ہو؟ طبیعت کیسی ہے؟" زین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"چاہتے کیا ہو؟ میری رسوائی؟" زین کا منہ زارا کے سوال پر کھلا' لیکن کوئی لفظ نہ نکلا۔ "بولتے کیوں نہیں؟ اس دن بھی اماں کے جنازے پر ساری اصلیت سب کے سامنے لے آئی' آج پھر وہی کام کروانا چاہتے ہو؟" زین مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ وہ غصہ میرے آنے کا نہیں تھا۔ وہ صرف انتظار کے بعد کا غصہ تھا۔ اس صحن میں تمہارے رشتے دار تو تھے' لیکن تمہارا اپنا کوئی نہیں تھا۔ تمہیں کسی اپنے کا انتظار تھا اور مجھے دیکھتے ہی تم پھٹ پڑیں۔ اناپ شناپ بول کر تمہارے اندر کی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ تمہارا سارا غم میرے اوپر چیخ کر ہلکا ہوگیا تھا۔ تمہارے وہ آنسو جو اندر گر رہے تھے باہر نکل آئے۔ یہ گول گول کالی کالی آنکھیں کھول کر مجھے کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ پوچھو نا۔۔۔ کس بات کا انتظار؟ اس بات کا انتظار کہ میں اسی وقت کیوں نہ آگیا جب تم اکیلی تھیں۔" زارا نے آنکھیں چرا کر بائیں طرف چہرہ موڑ لیا۔ زین اس کے بائیں جانب آگیا۔ زارا نے آنکھیں اٹھائیں اور گھور کر بولی۔

"کہاں سے بنا لیتے ہو کہانیاں؟ اس من گھڑت کہانی سے تمہاری وہ عزت واپس آجائے گی جس کے اندر کی بدبو میں نے اس دن ساری دنیا کو سونگھا دی؟" زین کھل کر ہنسا۔

"اچھا تو وہ بدبو تھی' فزکس پڑھاتے پڑھاتے کہاں اپنا دماغ لفظوں پر لگاتی ہو۔ کسی افسانے یا ناول کی ہیروئن نہیں ہو۔ میری زندگی کا مقصد ہو۔ آسان لفظوں میں بھی کہوگی تو سمجھ جاؤں گا۔ جہاں تک بات رہی تمہارے اس دن کے چیخنے کی۔ حقیقت صرف اور صرف اتنی تھی کہ تمہیں ڈر تھا کہ میں مکر نہ جاؤں۔ میں محبت کے دعوے سے دستبردار نہ ہوجاؤں۔ کاش تم خود کو اس وقت دیکھ سکتیں' میرے جواب پر تمہاری آنکھوں میں کتنے سکون کے پنچھی آ بیٹھے تھے' تمہیں پتا ہے مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ میں ہر حال میں تمہیں پانا چاہتا ہوں اور تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہوگئی ہے کہ تم میرے بغیر زندگی کا تصور نہیں کرسکتیں۔" زین پھر شوق سے نظر ڈالنے لگا۔

"اپنی من گھڑت کہانیاں اپنے پاس رکھو۔ تمہیں پتا ہے زین۔۔۔ میں نے کل محبت کے اصول سیکھے' محبت کے اصولوں میں سب سے اول اصول ڈرنا ہے' دوسرا بچنا ہے اور تیسرا پھر ممتاز ہوجانا ہے۔ تم کہتے ہو تم محبت کرتے ہو۔ تم کہاں ڈرتے ہو؟ تم کہاں مجھے رسوائی سے بچاتے ہو؟ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تمہارا میرا رشتہ اگر استوار ہو بھی گیا تو دنیا کبھی ہمیں عزت نہیں دے گی۔ تم کہاں مجھ سے محبت کرتے ہو؟" یہ عجیب سوال تھا جو زارا کے لبوں سے نکلا۔

"تمہارے خیال میں ڈر کی صرف ایک ہی شکل ہے؟ بندہ بچے؟ بندہ تعلق ظاہر نہ کرے؟ میں نے میم شہناز سے کہا تھا کہ اس بات کو' ابھی کسی کو پتا نہ چلنے دیں' تاکہ تمہارے لیے مسئلہ نہ ہو۔ لیکن اب کل اس بات کا سامنے آنا بہتر تھا۔ میں بھی ڈرتا ہوں' لیکن اپنی محبت کے اظہار سے نہیں بلکہ تمہیں کھودینے سے۔ میرے سامنے سطحی باتیں نہ کیا کرو۔ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں' یہ دنیا کسی حال میں جینے نہیں دیتی۔ محبت کی دولت جب دامن میں ہو تو دنیا کی طرف سے پھینکے جانے والے پتھر بھی پھول لگتے ہیں۔ تمہیں اتنا تو یقین ہونا چاہیے کہ میں تم پہ کبھی کوئی انگلی اٹھنے نہیں دوں گا۔ مجھے لفظوں سے باندھ کر تم [illegible] نہیں لے جاسکتیں جو چاہتی ہو سیدھی

طرح کہو۔" زین سمجھ رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

"میں چاہتی ہوں تم میری زندگی سے نکل جاؤ۔" زارا نے پہلی بار کچھ مانگا۔

"افسوس جو تم نے مانگا ہے وہ میں تمہیں دے ہی نہیں سکتا۔" زین نے صاف انکار کیا اور زارا سے دو قدم دور ہوا۔ "پہلا انکار کیا ہے' تمہارے سامنے اس کی کچھ سزا تو ملنی چاہیے۔" زین نے پلک جھپکتے اپنے ہاتھ میں بیکر پکڑ کر داہنی کلائی پہ توڑا۔ زارا جتنی دیر تک اس کے پاس پہنچی۔ خون کے قطرے زمین چومنے لگے۔

"بے وقوف انسان یہ محبت نہیں جذباتیت ہے' جنونیت ہے۔" زارا کو اس پہ غصہ آیا۔

"جذبوں کو پاکیزگی سے۔ جنونیت کی انتہا تک تمہیں چاہا ہے۔ میرے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ لیکن میں تمہارے لیے ایسا ہی ہوں' دیوانہ سا۔" زین اپنے گلے سے ٹائی کھول کر بازو پہ لپیٹنے لگا۔

"اپنے اور میرے ساتھ یہ مذاق نہ کرو۔" زارا نے خون کے قطروں پہ نظر جما کر مٹھیاں بھینچے ہوئے کہا۔ زین اس کے پاس آیا اور اس کا چہرہ انگلی سے اٹھا کر بولا۔

"یہ مذاق نہیں ہے زارا' میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"اگر تمہیں محبت ہے تو پھر ثابت کرو۔" زارا نے چیلنج کیا۔

"یہ چوتھا احسان ہے تمہارا!" زین حقیقتاً" خوش ہوا وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جان بھی دے سکتا تھا۔

"پہلے تین احسان ہی بتادو آج!" زارا میں تجسس نے سر اٹھایا۔

"پہلا مجھے نظر آنا۔۔۔ تمہیں دیکھ کر میں نے زندگی کے نئے معنی خود پہ آشکار ہوتے ہوئے دیکھے۔ اتنے رنگ کہ مجھے لگا' میں ان میں ڈوب جاؤں گا' بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری آنکھوں میں جھانکنے سے ڈوبنے کی خواہش انگڑائی لیتی ہے۔ دوسرا احسان مجھے بچہ یا بیٹا نہ کہنا۔۔۔ یہ احسان کرکے تم نے مجھے باور کروایا کہ کم از کم میری محبت تمہاری نظر میں تو آئی۔ تیسرا احسان مجھ پہ بھروسا کرنا۔۔۔ مجھ سے عاقب کے معاملے میں مدد لینا۔ وہ صرف مدد نہیں تھی' ذمہ داری تھی اور تم نے ذمہ داری ڈال کر میرے شانے چوڑے کردیے اور چوتھا احسان میرا ہوجانے کی خواہش کرنا۔۔۔ محبت ثابت کروانا چاہتی ہو' یعنی میری ہونا چاہتی ہو؟" زین ہنس کر اسے انگلیوں پہ گن کر بتانے لگا۔

"تم پاگل تو نہیں؟ اتنے ہی عاشق ہو تو پہلے ثابت کرکے دکھاؤ۔" زارا مسلسل چیلنج کرنے پر تلی رہی۔

"صد شکر کہ تم نے مجھے عاشق کہا۔ تمہیں اتنا اندازہ تو ہے کہ میں محبت سے ایک درجہ آگے جاچکا ہوں۔" زین ہر بات پر احسان لینے پر تلا رہا۔

"تم اپنی عمر دیکھو اور اپنی باتیں دیکھو۔" زارا نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"بار بار عمر کی باتیں نہ کیا کرو۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی۔ ان دونوں میں عمر کا کتنا فرق تھا۔ پچیس سال۔۔۔ سمجھتی ہو پچیس سال کتنے زیادہ ہوتے ہیں؟ میرے اور تمہارے درمیان عمر کا فرق کتنا ہوگا؟ صرف چار یا پانچ سال۔۔۔ میں جب تم سے محبت کا بھی دعوا کررہا ہوں تو تم کیوں یہ بڑے چھوٹے کی گردان دہراتی چلی جارہی ہو؟" زین اپنی شہد رنگ آنکھوں میں اپنی محبت سموتے ہوئے بولا۔

"ویسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کی پیروی نہیں کرنی' لیکن اگر عمر میں بڑی لڑکی پسند آجائے تو فوراً" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور خدیجہؓ کی مثال دینا یاد آجاتی ہے۔ کیا وہ صرف مثال دینے کے لیے ہیں؟" زارا نے اس کی آنکھوں سے عیاں محبت کا جذبہ نظر انداز کرنا چاہا۔

"نہیں۔۔۔ میں صرف مثالیں دینے والوں میں سے نہیں ہوں' میں حتی الامکان کوشش کرتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کروں' لیکن تمہارے معاملے میں بالکل بے بس ہوں۔ میں تمہاری بہت

عزت کرتا ہوں۔ مجھے محبت کا کوئی اصول نہیں پتا' معاشرے کی حدود و قیود کا بھی نہیں اندازہ' لیکن یہ جو تمہیں دیکھ کر میری دھڑکن تیز ہو جاتی ہے تو یہ محبت ہی ہے۔ میری ذات کی تکمیل کے لیے تمہارا ملنا ضروری ہے۔" زین ابھی بھی بضد ہوا۔

"مجھ سے آنے والی ہر شعاع ہر چیز جذب کرسکتے ہو؟" زارا نے سوال پوچھا۔

"ہاں....." ایک لفظی جواب ملا۔ وہ بھی کسی ٹریک پر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"محبت ثابت کرسکتے ہو؟" گھنی پلکوں والی آنکھیں دوبارہ اٹھیں۔

"مجھے تمہیں جیت کر خوشی ہوگی۔" اعتماد مسکرایا۔ ان آنکھوں میں دیکھ کر وہ چاند توڑ لانے کا دعوا بھی کر سکتا تھا۔

"مجھے دیکھے بغیر' مجھے پانے کی کوشش کرو۔ ثابت کرو کہ تمہاری محبت عام محبت نہیں ہے۔ عادت کی غلام نہیں ہے۔ دیکھنے چھونے کی حاجت سے ماورا ہے۔ ثابت کرو کہ میری عزت کے خواہاں ہو۔ مجھے آنچل پہنانا چاہتے ہو۔ ثابت کرو کہ مجھے دیکھے بغیر بھی مجھے پانے کو اتنا ہی مچلو گے۔ مجھے اپنا نام دو گے۔ مجھے اپنی پہچان دو گے۔ مجھے دیکھے بغیر مجھ سے بات کیے بغیر مجھے اپناؤ گے۔" زارا نے زمانے کے حساب سے بہت بڑی بات کی۔ آج کل کون کاٹتا ہے یہ مشکلیں.....

"منزل کا سایہ بھی نظر آ رہا ہے تو سفر میں آسانی ہوتی ہے۔ صعوبتیں آسانی سے جھیل لی جاتی ہیں۔" وہ بدکا۔

"بس اتنی سی محبت تھی؟" اس نے طنز کیا۔

"ایسے نہ کرو۔" وہ التجائیہ انداز میں گویا ہوا۔

"بس اپنی سو کالڈ محبت کا پنڈورا باکس اٹھاؤ اور چلتے نظر آؤ۔" زارا نے نظروں میں فاصلے بھر لیے۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ وہ قریب آ کر دور ہوئی۔ خوشبو کا جھونکا جیسے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ سفر کر رہا ہو۔ زین کو احساس ہوا وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔

"سوچ لو!" وہ پورے یقین سے بولا۔

"سوچ لیا ہے۔" زارا نے مسکرا کر کہا۔

"پتا چلے کہ مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔ گلیوں میں بغیر جوتوں کے میرا نام لیے دوڑ رہی ہو۔ میری تلاش میں باؤلی ہو گئی ہو۔ مجھے دیکھنے کو ترس گئی ہو اور اگر نوبت یہاں تک آ گئی تو دیکھنا پھر میں....." زین نے انگلی اٹھا کر بات ادھوری چھوڑی تھی' زارا کا دل کسی انجانے خوف سے کپکپایا۔ اس نے دل کی گستاخی پہ خود کو ڈپٹا۔

"نوبت لاؤ' پھر بات کرنا۔" اتنا کہہ کر چہرہ موڑ لیا۔

وہ زارا تھی۔ زین گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔

"آخری دفعہ دیکھنے دو..... پھر ملیں گے جب اللہ نے ملایا۔" زین نے بھرپور نگاہ ڈالی اور ہلکے سے زارا کا ہاتھ چھوا اور ہلکا سا چھو کر تھام لیا۔ زارا کی دھڑکنوں نے بے ایمانی کی۔ اسے لگا کہ کسی نے روح تھام لی ہے۔

"انسان ہوں' فرشتہ نہیں۔ تھوڑا سا بہک تو سکتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔" اسی لمحے اس نے ہاتھ چھوڑا اور چلا گیا۔ زارا وہیں کھڑی رہی۔ دل یکبارگی دھڑکنوں سے جنگ کرنے لگا' کچھ انہونا تھا' کچھ مختلف.....

اس فقیر نے پنجرے کا دروازہ کھول کر دو کبوتر باہر نکالے۔ دونوں وہیں پنجرے کے پاس رکھے۔ فقیر نے ایک کبوتر کو ہاتھوں میں پکڑا اور مشرق کی جانب آزاد کرتے ہوئے بولا "پھر ملیں گے جب اللہ نے ملایا..... اللہ ہو۔" پھر دوسرے کبوتر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسے مغرب کی طرف پرواز کے لیے چھوڑا۔ "اللہ ہو..... پھر ملیں گے جب اللہ نے ملایا۔ اللہ ہو..... اللہ ہو۔" دونوں کبوتر آسمان پر مختلف سمتوں میں پرواز کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆
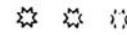
زارا کا اب اکثر وقت نیچے ہی گزرتا۔ آج چہلم تھا اور مغرب کے بعد عورتوں کی آمد میں اضافہ ہو گیا۔ لوگ دعا کرتے اور چلے جاتے۔ عشا کا وقت ہوا' سب اپنے اپنے گھروں میں واپس پہنچ گئے۔ سلیم انکل مسجد

سے نماز پڑھ کر لوٹے تو ساتھ کوئی آنٹی تھیں۔ انہیں زارا نے آج پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ اٹھ کر پانی لینے چلی گئی کہ نشا تو یوں بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتی۔ کشور بیگم ذرا ٹھٹک کر اس عورت کو دیکھنے لگی۔ سلیم صاحب کے انداز بتا رہے تھے کہ بات کچھ خاص ہے۔

زارا نے میٹھا پانی ٹرے میں رکھے گلاس میں پیش کیا۔ خاتون نے پانی پیا۔ حسب رسم دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اس کے بعد سب کو امید تھی کہ واپسی کے لیے روانہ ہوں گی۔ سلیم انکل نے اب تعارف کروانا مناسب سمجھا۔

"ٹینکی والی گلی میں رہتی ہیں۔ ہر جمعرات ان کے گھر سے پھل آتا ہے اور ایک رشتہ لے کر آئی ہیں!" سلیم کی بات پہ کشور چوکنی ہو گئی۔

"بھائی صاحب شرمندہ نہ کریں۔ وہ پھل بھی کیا پھل ہوتا ہے ایک پلیٹ پھل سے زیادہ ہماری بھی اوقات نہیں ہے۔" وہ سادہ لوح سی خاتون کھری بات کرنے والی لگیں۔ ایک دفعہ پھر خاموشی رینگنے لگی!

"بات کچھ یوں ہے..... میں اپنے بیٹے کے لیے آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آئی ہوں!" خاتون نے پھر آواز نکالی۔

"کیا کرتا ہے آپ کا بیٹا؟" کشور بیگم کی خوشی چہرے سے ایک دم ٹپکی۔

"ابھی تو پڑھ رہا ہے!" آگے سے سادہ سا جواب ملا۔

"کیا پڑھ رہا ہے؟" سوال پھر ابھرا۔

"دسویں کا امتحان دے گا اس سال!" جواب سب کو حیران کرنے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

"بی بی کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میری بیٹی نشا تو ابھی بارہویں جماعت میں ہے۔ تمہارے بچے کی عمر کی میری کوئی بیٹی نہیں!" کشور بیگم نے تنک کر جواب دیا۔ بیٹی کا رشتہ آجائے چاہے کسی قابل ہو یا نہ ہو خوشی بہت ہوتی ہے' وہی خوشی لہجے میں جھکنے لگی۔

"بہن میں نشا کا نہیں زارا کا رشتہ مانگنے آئی ہوں۔ میرے بیٹے کا نام زین ہے۔ سنا ہے شاید اس دن آپ کے گھر میں بھی کوئی بدمزگی ہوئی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ وہ بچہ ہے نا سمجھ ہے۔ اسے جنازے میں شریک ہونا بھی تھا تو گھر سے باہر سے شریک ہو جاتا!" خاتون اب کھل کر سامنے آئیں۔

زارا کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ سلیم صاحب اس وقت قبرستان سے قبر کشائی کے بعد گھر آ رہے تھے اور لین دین میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہیں سے جنازہ اٹھانے کا عندیہ دے دیا تھا۔ اس لیے حیران پریشان رہے۔ کشور بیگم کی ساری خوشی پچھلے لمحے کا اژدھا نگل گیا۔

"بی بی پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ خود کہہ رہی ہو نا سمجھ ہے' پاگل ہے تو ایسے میں اس کا رشتہ طے کرنا یا مانگنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اس سے کہیں بہتر ہے اسے پڑھاؤ لکھواؤ۔ بچے کی باتوں میں آ کر رشتہ لے کر آ گئیں کل کو وہی بیٹا اپنی پسند کے آگے چوں نہیں کرے گا اور تکی لٹی میں آ کر تمہیں گھر سے چلتا کر دے گا۔" کشور بیگم کو جیسے کسی شے نے کاٹ لیا۔ زارا کو اپنا حلق کڑوا محسوس ہوا لیکن وہ زہر پی گئی۔ کچھ اور بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن کسی دوسرے کی زبان آپ کے اختیار میں نہیں ہوتی۔

"بہن جی آپ کو میرے آنے پر اعتراض ہے یا رشتے پر اعتراض ہے؟" خاتون بھی اب تھوڑی جز بز ہوئیں۔

"مجھے آپ کی مغربیت پر اعتراض ہے۔ یہ کوئی آدھی آستینوں کی قمیص نہیں جسے آپ خود پہن لیں گی اور کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔ یہ ہمارے اور آپ کے خاندان کی بات ہے۔ اس ماڈرنزم کو اپنے گھر میں رکھیں۔ ہم نہ تو اپنے بچوں کے کہنے پر چلتے ہیں اور نہ ہی اتنی چھوٹی عمر میں رشتے طے کرتے ہیں!" کشور بیگم نے سیدھی چوٹ خاتون کے فولڈ ہوئے بازوؤں پر کی۔

"ارے ارے ماڈرنزم کیا اور کہاں کا؟ یہ تو اسلام ہے۔ کیا اسلام نہیں کہتا کہ جب بیٹی جوان ہو جائے تو اسے اس کے گھر کا کر دو؟ یہ تو ہم تم دنیا کے رنگ میں رنگے گئے ہیں۔ کہتے ہیں ذرا بچوں کو پاؤں پر کھڑا ہونے

دیں۔ اپنے رزق کا بندوبست کرنے کے قابل ہو جائیں تو پھر بیاہ رچائیں۔ میرا یقین میرے اللہ سوہنے پہ ہے۔ جو اللہ سوہنا مجھے رزق دے رہا ہے وہ میرے بیٹے میری بہو کا بھی رزق دے گا۔۔۔ جہاں تک بات رہی کہ میں بیٹے کے کہنے پر رشتہ لے آئی ہوں تو کیا غلط کیا؟ اسلام بھی پسند کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ مجھے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میرے بیٹے نے کوئی برا راستہ اختیار کرنے کے بجائے مجھے صاف صاف بتا دیا ہے۔ اب یہ میرے ہاتھ میں ہے کہ اسے جائز راستہ دوں یا پھر ناجائز پہ جانے دوں۔ آج کل بے راہ روی کی بڑی وجہ دیر سے شادی ہے۔ عمر پچاس برس رہ گئی ہے اور شادی پچیس میں ہوتی ہے۔ شریک حیات شریک حیات نہیں رہتی۔ آدھی حیات میں شریک ہوتی ہے۔ ہم اپنے بنائے قاعدے اور قوانین لاگو کر کے اسی دنیا کو خود اپنے لیے تنگ کر رہے ہیں!' خاتون اب مدھم سی آواز میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"اپنے لیکچر کی بوری اٹھاؤ اور یہاں سے جاؤ۔ ہماری طرف سے تمہارے لیے صاف انکار ہے۔ کھانے کو بندہ اچار بھی کھا لیتا ہے لیکن کمائی تو ہونی ہی چاہیے۔ بھلا بیٹیاں بندہ اندھا ہو کر کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کو پکڑا دے۔ بیٹیاں نہ ہو گئی بھیڑ بکریاں ہو گئیں۔ بیٹے کو اتنا ہی شوق ہے تو اسے کہو جائے اور کمائے پھر رشتہ لے کر آئے!" کشور بیگم نے انتہائی خفگی سے اس عورت کو چلتا کیا۔

سلیم صاحب تو میدان گرم ہوتے ہی باہر نکل گئے۔ زارا دروازے کے باہر دیوار سے چپکی کھڑی رہی۔

خاتون باہر نکلی تو زارا کے پاس رک گئی۔ زارا کا معصوم۔۔۔ روشن چہرہ' چھریرہ سا بدن' بدن پہ رینگتی جھجک اور انگلیوں کے موڑنے کا انداز زین کے کھینچے نقشے پہ پورا اتر رہا تھا۔

"میں سلطانہ ہوں۔۔۔ زین کی ماں۔۔۔ تم زارا ہو نا؟" زارا نے پلکیں جھپکا کر اشارہ ہاں میں کیا۔ اس کی کالی آنکھوں میں سچائی کی شمعیں روشن تھیں۔

"تمہارا کیا جواب ہے؟" اس عورت کے لہجے میں امید کے دیے جل بجھ رہے تھے۔

زارا نے ایک لمحے کو سوچا۔ دل چاہا کہ محبتوں کی زنبیل اٹھا کر دہلیز پار کر جائے۔ اسے محبت ہی کرنی تھی۔ اب۔ چاہے اس گھر میں کرتی یا باہر رہ کر۔ اس نے ایک اسی صفت کے لیے اپنے دامن کو گداز پایا تھا۔ پھر اول خویش بعد درویش دماغ میں سما گیا۔

اس نے نظریں جھکائی اور صاف آواز میں بولی۔

"میرا بھی یہی جواب ہے۔ اسے کہیں کمائے اور پھر رشتہ لائے!"

اوکھے پینڈے لمبیاں راہواں عشق دیاں
درد جگر سخت سزاواں عشق دیاں

☼ ☼ ☼

زارا نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ اسے اللہ کی محبت حاصل کرنی ہے۔ کہیں روشنی کی رمق کی طرح وہ ایک بار زندگی میں شامل ہو جائے تو پھر اندھیرے ہر جنگ ہار جائیں گے۔ اس نے اپنے دل کے برتن میں جھانک کر دیکھا۔ اس نمانے برتن سے باسی جذبوں کی منافقانہ سی بو آئی۔ وضو کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر دل صاف کیا۔

نیچے سے عجیب سی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ فجر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ وہ پریشان ہوئی۔ ایک دل کیا نیچے جائے پھر خوف آیا۔ وہ اس کا یوں آنا برداشت بھی کریں گے یا نہیں؟

"مجھے اگر کسی سے محبت کرنی ہے تو صلے کی تمنا کیے بغیر کرنی ہو گی۔" اس نے خود کو سمجھایا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔

کشور بیگم کے رونے کی آواز تھی اور مسلسل آ رہی تھی۔ کبھی اس عورت کو روتے ہوئے نہیں سنا تھا شاید اسی لیے آواز عجیب لگی۔ اس نے اپنے قدم دھیرے دھیرے ان کے کمرے کی طرف بڑھائے۔ سلیم انکل دروازے کے پاس فرش پر گرے ہوئے تھے اور کشور بیگم ان کے پاس بیٹھی زار و قطار روئے چلی جا رہی تھی۔ زارا نے بھاگ کر سلیم انکل کی نبض دیکھی۔ وہ نہیں رہے

تھے۔ اسے شاک لگا!

یہ کچھ ہی دنوں میں اس گھر سے اٹھنے والا دوسرا جنازہ تھا۔

جس نے یوں جنازے نہ دیکھے ہوں اس کے لیے اچنبھے کی بات ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دکھ یونہی ایک لڑی میں بندھے آتے ہیں پھر اللہ کے پیارے بھی پکار اٹھتے ہیں۔۔۔ عام الحزن! عام الحزن!

زارا بالکل بھول گئی کہ ابھی کل ہی اس نے صحن میں کھڑے ہو کر اس مرے ہوئے شخص کو اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار گردانا تھا۔ اسے یاد تھا تو فقط یہ کہ یہ اس گھر سے اٹھنے والا دوسرا جنازہ تھا۔

شادیاں بھلائی جا سکتی ہیں' جنازے نہیں بھولتے! زارا کو اپنا آپ بے بس محسوس ہوا۔

"میں نشا کو بلا کر لاتی ہوں!" وہ اپنے آپ کو اس خاندان کا حصہ سمجھ رہی تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ اس جنازے کا بوجھ صرف اپنے کندھوں پر لادنا مشکل لگا۔

"مر گئی ہے نشا۔ وہ ہی مار گئی ہے اپنے باپ کو۔ نام مت لو اس کا۔۔۔ مر گئی وہ!" کشور بیگم ہذیانی انداز میں چلائی۔ زارا نا سمجھی کی کیفیت میں کشور آنٹی کی شکل دیکھنے لگی۔ یہ چہرہ اسے کبھی شناسا نہیں لگا تھا۔ ہمیشہ رعب جھاڑنے والا چہرہ۔ آج نجانے کیوں کچھ اپنا لگنے لگا۔ غم چہروں کی ہیئت بدل دیتے ہیں۔ دکھ انسانوں کو قریب لے آتے ہیں۔ ان کے چہرے کی بے بسی میں اپنی ماں کی بے بسی کی شبیہ نظر آئی۔ کوئی انجانا سا خوف۔۔۔ کوئی انجانا سا ڈر۔۔۔ اس نے ڈر کو پڑھنا چاہا تو کشور چچی کے ہاتھ میں پکڑا کاغذ نظر آ گیا۔ وقت کبھی بھی رشتے بنانے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ یہ لمحوں کا وجدان ہوتا ہے جو کسی اجنبی کو شناسا بنا دیتا ہے۔ زارا نے کاغذ اپنے ہاتھ میں پکڑا۔

"ابا! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے ایک خط کے ذریعے آپ سے مخاطب ہونا پڑے گا۔ میں آپ کا سوچتی ہوں تو یہاں سے جانا نہیں چاہتی کیونکہ یہ واحد ضد ہے جو میں نے آپ کے سامنے نہیں کی۔

اماں مجھے اس معاملے میں اتنا ڈرا چکی ہیں کہ آپ سے بات کرنے سے بہتر ہے کہ میں بغاوت کر لوں۔ میں نے اماں کو بہت سمجھایا کہ کاشف کو ایک دفعہ گھر رشتہ لے آنے دیں لیکن انہیں لگتا تھا کہ سیدوں کی لڑکی کسی اور ذات میں نہیں بیاہی جا سکتی۔ آپ کو اپنی ذات پیاری ہے اور مجھے محبت پیاری ہے۔ اگر کاشف پیسے والا ہوتا تو شاید اماں کا دل نرم پڑ جاتا لیکن آسانیاں شاید میرے مقدر میں لکھی ہی نہیں گئی۔ اس گھٹن زدہ ماحول میں زندگی گزارنے سے بہتر ہے میں کاشف کے ساتھ کھلی ہوا میں روکھی سوکھی کھا کر زندگی جی لوں۔

نکلتے وقت میں نے بارہا سوچا آپ کو کس چیز کی سزا دے رہی ہوں پھر دل میں اوپر والے کمرے میں لیٹی زارا کا خیال آیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے دل سے لگتا ہے کہ یہ آپ کے اعمال کی سزا ہے۔ میں شاہد ہوں کہ آپ نے کبھی ثمینہ تائی اور زارا کا برا نہیں چاہا لیکن آپ نے کبھی اماں کو بھی ان کا برا چاہنے سے نہیں روکا۔ کاش آپ اپنے اندر کی اچھائی کو اماں پہ حاوی کر لیتے۔ میرا دل کہتا ہے کہ آپ کا جینا آسان ہو گا اور اماں کا مشکل۔ پتا نہیں اس کے پیچھے کیا وجہ ہے۔۔۔ شاید میری محبت۔۔۔ ظالم سماج کا کردار نبھانے والی اماں کو کوئی رعایت نہیں دینا چاہتی۔ پتا نہیں کیوں میرا یہ خط ختم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔

آپ کو میرے اور اپنے درمیان اتنے فاصلے نہیں پیدا کرنے چاہیے تھے۔ بیٹی کو تن کے لیے کپڑے اور روٹی کے علاوہ بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ تھوڑا سا وقت۔۔۔ کچھ لمحے۔۔۔ وہ کل آپ کے پاس نہیں تھے' آج میرے پاس نہیں ہیں۔ وہ فاصلہ جو آپ نے میرے اور اپنے درمیان انجانے میں پیدا کیا تھا۔ آج اسی فاصلے کو میں مزید بڑھا رہی ہوں۔ اس گھر سے کچھ نہیں لے کر جا رہی بس اپنے گزارے کچھ سال مشکل سے پلو سے باندھے ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

"آپ کی بیٹی نشا۔"

جس گھر سے بیٹی بھاگ جاتی ہے وہاں رات کیسے کٹتی ہے۔ زارا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک

بیٹی کے جانے سے.... جو زندگی کے رواں دواں ہونے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی.... اس ایک بیٹی کے جانے سے.... باپ کیسے مرتے ہیں۔ یہ سلیم کی لاش چیخ چیخ کر بتا رہی تھی۔ وہ جس نے کسی کی بیٹی کو احتیاط کرنے کا کہا تھا اور نہ کرنے کی صورت میں زندہ نہ چھوڑنے کی دھمکی دی تھی اپنی بیٹی کے انتہائی قدم پہ اتنا ٹوٹا کہ خود زندہ نہ رہ سکا۔ زارا نے کاغذ کو ہاتھوں میں رکھے رکھے مٹھی کو بھینچ لیا۔ اسے واقعی ان لوگوں سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ محبت ہو رہی تھی۔ اگر اوپر کے کمرے آسائشیں نہیں تھیں تو کیا ہوا۔ روحیں واقعی زندہ تھیں! نیچے سب ہی آسائشوں میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے جسموں میں سرمار رہے تھے۔

اپنی اپنی مردہ لاشوں کو جسم پہ گھسیٹتے ہوئے جیسے جا رہے تھے!

ان لاشوں کی بو نے زارا کو ماں یاد دلائی۔

ماں محبت کا راگ ٹھیک الاپتی تھی....

محبت جسم کی غذا نہیں بن سکتی لیکن روح کی غذا محبت ہی ہے!

پاکیزہ محبت!

☼ ☼ ☼

اگلے دن کے سورج نے ایک بدلی ہوئی زارا کو دیکھا۔ وہ حیران تھا۔ وہ لڑکی جو کل تک مکمل ٹوٹ گئی تھی۔ آج سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے بھی اس کی آنکھیں نہیں چندھیا رہی۔ وہ راضی برضا ہو گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ محبت کی چادر میں سمٹ کر وہ جتنی مطیع ہوئی اتنی ہی مضبوط بھی بنی۔ وہ اس بھرے میں صحن میں تنہا ذمے دار تھی۔ کشور چچی کو رونے سے ہی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس عورت کے غم کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا جس کی اولاد کی وجہ سے اس کا سہاگ ہی اجڑ جائے۔

عورتوں نے پوچھا کہ نشا کہاں ہے؟

اس سے پہلے کشور بیگم واویلا کرتی۔ زارا نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"سندھ.... کل شام ہی اپنی خالہ کے گھر گئی ہے!"

اس لمحے کشور بیگم کے سارے لگائے گئے الزامات ان کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسے۔ جب جنازہ اٹھا تو لوگوں نے دیکھا کہ زارا میت کو کندھا دینے کے علاوہ ہر کام کر رہی ہے۔ کشور چچی کی نظریں یہ منظر نہ دیکھ سکیں۔ وہ وہیں گریں اور ان کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔ زارا نے بلقیس آنٹی کا ہاتھ دبا کر کہا۔ "گھر کا خیال رکھنا۔"

دو عورتوں کے ساتھ ٹیکسی میں ہسپتال نکل پڑی۔

یہ زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ اس میں وہ لمحات آتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا ہوتا اور وہ لمحات کبھی نہیں آتے جن کے انتظار میں رتجگے کاٹے ہوں۔ پاکستان کی ٹریفک کی طرح غیر متوقع سی زندگی.... جہاں پہیے کی کون سی طرف کب اوپر اور کب نیچے کرنے پڑ جائے.... گاڑی کو خود بھی پتا نہیں لگتا!

کشور بیگم کو فالج ہوا تھا۔ ان کی زبان سے ایک حرف بھی نہیں نکل رہا تھا۔ یہ صرف آنکھیں تھیں جو بول رہی تھیں۔ اور آنکھیں بھی کیا خوب بولتی ہیں۔ ساری ندامت رواں تھی۔ اس روانی میں شدت آگئی جب زارا نے اپنی ماں کی آخری نشانی اپنے کانوں کی بالیاں ڈاکٹر کے سامنے فیس کے متبادل کے طور پر پیش کیں!

☼ ☼ ☼

"میں گئی تھی اس کے پاس.... کیا سن کر آئی ہوں بتا چکی ہوں۔ اب تم بتاؤ کیا ارادہ ہے؟" سلطانہ اپنے بیٹے کا سکون دیکھ کر پریشان ہوئیں۔

"اماں ارادہ بھی وہی ہے اور منزل بھی وہی!" زین سکون سے بولا۔

"تجھے شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں کرتے ہوئے؟" سلطانہ نے پیار سے ڈپٹا۔

"میری ماں ہے ہی اتنی اچھی کہ مجھے اس سے جھوٹ نہیں بولنا پڑتا۔ شاید ہی دنیا کا کوئی بیٹا اپنی ماں کو اپنے پسند کے بارے میں اتنی آسانی سے بتا سکتا ہو جس طرح میں نے بتایا!" زین نے ماں کے ہاتھ آنکھوں سے لگائے۔

"اب کیا کرے گا؟" سلطانہ تاحال پریشان تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بیٹے کی شہد شہد آنکھوں میں ملاوٹ ہو۔

"حکم کی تعمیل!" زین نے آنکھیں موند کر جواب دیا۔

"میرے یا اس کے!" ماں کی ممتا تھوڑی بے چین ہوئی۔ وہ آزمانے لگیں۔

"کبھی آپ کا اور اس کا کہنا متضاد ہوا تو بے فکر رہیں۔ بیٹا جیت جائے گا!" زین نے سچ بولا۔ جو بھی تھا وہ واقعی فرماں بردار تھا۔

"اللہ تجھے اس سے ملوائے۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیری خوشی میں میری خوشی!" سلطانہ نے فٹافٹ یقین کر لیا۔

"ماں دعا کرنا کہ اللہ مجھے اس سے ملوائے!" زین بے چین ہوا اور اٹھ کر باہر چل دیا۔

گھر کی منڈیر پہ پڑے مٹی کے برتن سے پرندے اپنے حصے کا دانہ چگتے رہے!

"ہم سب کا ایک مقرر کردہ دائرہ ہے۔ ہم لاکھ سوچیں کہ ہم نے بڑی لمبی چھلانگ ماری ہے اور دائرے سے باہر نکل آئے ہیں۔ کسی بھی انسان کو اللہ نے وہ ٹانگیں دی ہی نہیں جو اسے اللہ کے مقرر کردہ دائرے سے باہر نکال سکیں۔ ہم جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں وہ ہم نہیں کرتے۔ وہ اللہ کرواتا ہے۔ اور جو ہمارے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی خود نہیں ہوتا۔ اسے بھی اللہ ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ ہماری زندگی کی شطرنج میں ہم ہی گھوڑے ہیں۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا کہ ہم کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ لیکن یہ بساط بچھانے والا خوب جانتا ہے!

تمہاری ٹانگ کے ٹوٹنے میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ تمہاری ٹانگ نہ ٹوٹتی تو شاید کبھی تم یہاں بھی نہ آتے۔

تمہارا یہاں آنا کسی نہ کسی کے لیے تو ضروری ہو گا۔ تب ہی زندگی تمہیں کھینچ کر یہاں لائی ہے۔ حق بولو۔ حق! حق اللہ ہو.... حق اللہ ہو...."

مزار کے احاطے میں بیٹھا فقیر ایک معذور کو سمجھاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اللہ ہو.... اللہ ہو۔"

☼ ☼ ☼

زین نے اپنے باپ کا سایہ بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی زندگی میں کچھ تھا تو صرف ماں تھی!

اور ماں بھی ایسی جیسے تھر میں پانی کا قطرہ ہو، جیسے خوشبو میں رچا کوئی نشہ ہو، جیسے کسی نظم کے ردھم میں چھپا ہوا مزا ہو، جیسے گدگدی کے احساس تلے دبا ہوا سرور ہو، جیسے تتلی کے مچلتے ہوئے پروں میں رنگوں کا سماں ہو، جیسے ٹھنڈی ہوا کے اندر ہلکورے لیتا سکون ہو، جیسے بہتے پانی کے اندر ٹکراتا ہوا شور ہو، جیسے پہاڑ کی چوٹیوں پہ جھکا ہوا بادل آوارہ ہو، جیسے گھٹاؤں کے اندر چھپا طلسم ہوشربا ہو، جیسے مریض لاعلاج کے لیے اس کی امید اس کی دوا ہو.... پتا نہیں ماں صرف اس کو ایسی لگتی تھی یا سب کو ہی ایسی لگتی ہے۔ زین اس کے ساتھ ہر وہ بات بانٹ لیتا جو اس کے من میں سماتی۔

ماں بھی اپنی ساری ہی منوا لیتی یا اس کی من مانیوں میں خوش ہو جاتی۔ ان دونوں کے لیے زندگی سے بہترین تحفہ کوئی نہ تھا کیونکہ ان دونوں کی زندگی میں وہ خود تھے اور پسندیدہ تھے۔ اب زین کی زارا کے لیے پسندیدگی نے سلطانہ کو ایک لمحے کے لیے ہلایا۔

یہ وہ بچہ تھا جسے پانچویں کے امتحانات کی مکمل تیاری کروا کے امتحانات نہیں دینے دیے۔ من میں سمایا کہ حافظ قرآن بنانا ہے اور مسجد میں جا کر دم لیا۔ بچے نے کوئی ہوں ہاں نہیں کی۔ بس عمل کیا۔

سلطانہ بے شک کم پڑھی لکھی تھیں لیکن عقل شعور میں اچھی تھیں۔ سمجھ بوجھ رکھتی تھیں۔ اس نے اپنی شادی کے بعد اللہ سے اپنے میاں کے ہمیشہ ساتھ کی دعائیں مانگیں وہ نہ قبول ہوئیں، دل میں بال

آگیا اور یہ بال تب نکلا جب زین نے قرآن پاک حفظ کرلیا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھیں جن کو اللہ نواز کے اپنے قریب کرتا ہے۔ اب انہیں اللہ سے دور جانے سے خوف آتا تھا۔ وہ اس مقام پہ آگئی تھیں کہ باتوں کو رب کی مرضی کے پیمانے میں پرکھ لے۔ اس کی دعاؤں میں اللہ کی رضا مانگنا شامل نہیں ہوا تھا بلکہ رچ گیا تھا۔

اب زین کی خواہش جان کر سلطانہ نے سوچا کہ ہم اللہ سے ناراض ہو جاتے ہیں جو چاہے تو اگلی سانس نہ آنے دے۔ ہمارے دل میں اس کی مصلحت کے باوجود بال آجاتا ہے تو پھر اولاد کیا چیز ہے؟ اولاد کے لیے ماں باپ کی کیا وقعت ہے؟ میں نے زین کی نہ مانی اور اوپر والے نے مان لی تو میرا ٹھکانا کیا ہوگا؟ ایک خواہش کے ادھورا رہ جانے پہ اگر اس کے دل میں بال آگیا جو میرا ہی حصہ ہے تو دل کیسے دھڑکے گا؟

سارے خواب اور سارے اندیشے زین کے حق میں فیصلہ کروانے میں کامیاب ہوئے۔ ہوا اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ابھی اس نے بہت جگہ خوف کے طوفان برپا کر کے بہت سے فیصلے کروانے تھے۔

خوف فیصلے کرواتا ہے۔ فیصلے ٹھیک ہوتے ہیں یا غلط... یہ صرف وقت بتاتا ہے لیکن وقت کے طوفان کے سامنے جو اپنے فیصلوں پہ ڈٹ کر سوئے مقتل جاتے ہیں۔ وقت ان کے سامنے سر کو جھکا دیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"صبغتہ اللہ ومن احسن من اللہ صبغتہ۔"

وہ بوڑھا یہ کہتے ہوئے دانہ مزار کے صحن میں ڈالنے لگا۔ پرندے یوں آئے جیسے انہیں دانے پہ اپنا نام لکھا نظر آرہا ہو۔ فضا میں صبغتہ اللہ کی آواز گونج رہی۔ آسمان پہ سورج نے اپنے پنکھ [illegible] چھپنے لگی جیسے اندھیرے کا قرض [illegible] اندھیرے کے تال میل سے پرندوں [illegible] فلک پر ڈالی اور اڑان بھرلی۔ اب غول [illegible] نظر آنے لگے۔ مزار کے صحن سے بھی سارے پرندے غولوں میں شامل ہو گئے۔ بوڑھے نے پھر آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

صبغتہ اللہ... صبغتہ اللہ...

کپڑے ابھی ہی ختم ہوئے۔ زارا نے انہیں پھیلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دروازے پہ دستک سنائی دی۔ امید نے یوں سر اٹھایا جیسے بنجر زمین میں اچانک کوئی بیج نمو پاتا ہے۔ دروازہ کھولا تو سامنے بلقیس آنٹی کھڑی نظر آئیں۔ کوئی امید ٹوٹی تھی۔

"آئیں آنٹی بیٹھیں!" زارا نے پلاسٹک کی کرسی باقی تمام کرسیوں سے الگ کر کے سامنے رکھی۔ بلقیس بیٹھ گئیں۔ زارا تیزی سے کام نمٹاتی نظر آئی۔ سامنے کھڑکی سے آدھی سوئی آدھی جاگی کشور بیگم بھی دکھائی دیں اور ان کے منہ سے رال بہہ رہا تھا۔ نظر بھر کر اوپر والے کمرے کو دیکھا تو غیر آباد دکھائی دیا۔ ان کے منہ سے اچانک نکلا۔

صبغتہ اللہ صبغتہ اللہ..."

زارا تب تک کپڑے پھیلا چکی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

"کچھ کہا آپ نے!"

"میں تو بس اللہ کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔ واقعی اللہ کا رنگ تو سب رنگوں سے پکا ہے اور اللہ کے رنگ کی ذرا سی چاہ کرو تو وہ آپ کو رنگ ور نگ کر دیتا ہے۔ اس کا رنگ نور جو ہے اور نور کہاں ہے؟ نور چار سو ہے۔ مجھے تو اب یہ گھر بھی نور کا منبع لگتا ہے۔" بلقیس آنٹی مکمل متاثر لگیں۔

"آنٹی آپ کیسی بات کر رہی ہیں۔ میں نے تو ایسا [illegible] نہیں کیا۔ یہ آپ کا حسن نظر ہے۔ میں نے صرف آپ کی بات مانی ہے۔ اپنے اردگرد کے لوگوں سے محبت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پتا ہے جب آپ نے مجھے یہ بات سمجھائی تو میرا دل چاہا کہ میں کسی [illegible] یا ایدھی سینٹر چلی جاؤں۔ وہاں کے لوگوں سے محبت کروں۔ مجھے لگتا تھا میں کشور چچی سے کبھی محبت کر ہی نہیں سکتی لیکن دیکھیں نا وقت بھی کیا دکھاتا ہے۔ نشا کو اس کی خالہ لے گئیں اور یہ خدمت میرے حصے میں آئی۔ اب مجھے لگتا ہے کہ میں یہاں آئی ہی اس لیے تھی۔ اپنی ماں کی گود میں اس گھر کا سفر اللہ نے اس لیے ہی میرے نصیب میں لکھا تھا کہ میں یہ کر سکوں۔ میں اپنی کوئی بڑائی نہیں کر رہی لیکن یقین جانیں جو سکون مجھے یہ بے لوث محبت کر کے ملتا ہے' اس سکون کو اگر میں اپنے آگے پیچھے ریوڑیوں کی طرح بانٹنا شروع کر دوں تب بھی یہ ختم نہیں ہوگا!" زارا کے چہرے کی الوہی سی چمک بلقیس آنٹی کو بہت بھائی۔

"یہی تو ساری بات ہے گڑیا وہ خالق ہے اور تخلیق سے محبت کرتا ہے۔ تم اس کی تخلیق ہو اور اگر اس کی باقی مخلوق سے محبت کرو گی تو وہ اپنی محبت تمہیں ضرور دے گا۔" بلقیس آنٹی اپنے ہاتھوں سے روشن کیے دیئے کی لو سے آنکھیں خیرہ کرتی بولیں۔

"آنٹی محبت کی قسم بھی ہوتی ہے؟ کیسے پتا چلتا ہے کہ کون سی محبت ٹھیک ہے کون سی غلط ہے؟" دل نے زارا کو سوال کرنے پہ اکسایا۔

"محبت ٹھیک اور غلط بھی ہوتی ہے؟ محبت محبت ہوتی ہے اور ہمیشہ محبت رہتی ہے۔ ہر وہ محبت ٹھیک ہے جو آپ کو اللہ کے قریب کر دے اور آپ کے اردگرد بسنے والوں کو نفع دے۔ اگر آپ کو کسی جذبے پر محبت کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ آپ کو اللہ کے سامنے گڑگڑانے پر مجبور نہیں کرتا... وہ جذبہ آپ کے ہاتھوں میں دعا بن کر نہیں اترتا یا پھر آپ کے اردگرد بسنے والوں کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ جذبہ کچھ بھی ہو سکتا ہے محبت نہیں ہو سکتی۔ محبت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس سے دل میں کھٹک نہیں ہوتی۔ اس میں قدم نہیں بندھتے۔ محبت آپ کو بے لگام کر دیتی ہے لیکن خود سر نہیں کرتی۔ محبت کرنی ہے تو وہ کرو جو اللہ کو بھائے... اللہ سے ملوائے... جس کو اللہ ملوائے"

بلقیس آنٹی نے کھوجتی آنکھوں سے جواب دیا۔ زارا کے دل کے چور نے چہرے کے رنگ بدلے۔ اس سے پہلے کہ دھاگے کا سرا بلقیس آنٹی کو دکھائی دیتا زارا ان کے لیے پانی لینے چل دی۔ اس نے نشا کا راز سنبھال لیا تھا اپنی بات کی بھنک کیسے پڑنے دیتی۔

"کیسے ہو رہا ہے گزارا؟" بلقیس آنٹی نے گلاس پکڑتے ہوئے سوال پوچھا۔ عورتیں کیسی بھی کیوں نہ ہو' موضوعات ایک جیسے ہوتے ہیں!

"دو دکانیں ہماری تھیں اور تین کشور چچی لوگوں کی! ان کے کرائے سے بس گزر بسر ہو ہی جاتی ہے۔ پچھلے مہینے ہی شبیر انکل نے تیسری دکان بھی اپنے لیے لے لی ہے۔" زارا کے بتانے پر بلقیس آنٹی نے سر ہلایا۔

شبیر انکل محلے بھر کے انکل تھے۔ کپڑوں کی دکان تھی جو آہستہ آہستہ خوش اخلاقی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اللہ کا رنگ ہرا یا سفید نہیں ہے۔ اللہ کا رنگ اس کی صفات کا رنگ ہے۔ کوئی ایک وصف جو اس کو پسند ہو اپنے اندر بے دار کر لو پھر چاہے پیلے ہو جاؤ یا نیلے۔ اللہ کا رنگ ساتھ نہیں چھوڑتا۔ سایہ بن کر ساتھ ساتھ دوڑتا ہے!

جیسے زارا پر مخلوق سے محبت کا رنگ چڑھا...

جیسے بشیر انکل پہ خوش اخلاقی نے رنگ چڑھا دیا...

سارا کھیل ہی رنگ کا ہے...

اللہ کا رنگ... صبغتہ اللہ...

☼ ☼ ☼

دن رات کی جھولی میں گرتے رہے اور رات دن کے آنگن میں کھلتی رہی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب سال مزید گزر گیا۔ اس کے خیال بھی دستک دیتے رہے اور وہ بھی اپنا دامن بچاتی رہی۔

ایک سامنا تھا جو نہیں ہوا۔ ایک دعا تھی جو محفوظ کر لی گئی۔ اللہ نے تا حال نہیں ملوایا۔ وہ خواب ہے یا حقیقت... زارا بے خبر رہی۔ اس چارہ گر کا خاموش انتظار مشکل ہونے لگا تھا۔ خواب کو زندہ ہونے کے لیے نیند چاہیے تھی۔ اور زندگی کے تیز جھونکے آنکھ کو لگنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

آج سورج کا غیض و غضب اپنے پورے عروج پہ تھا۔ مجبوریاں اپنا منہ کسی اژدھے کی طرح کھول کر

کھڑی تھیں۔ مجبوریوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کیا کیا مصیبتیں سامنے آسکتی ہیں مجبوریاں سفر کرواتی ہیں اور سفر میں رکھتی ہیں۔ پتا بھی نہیں چلتا کہ اس سفر میں مجبوریوں کا پیچھا کرتے کرتے زندگی گزر جاتی ہے۔

کشور چچی کی دوائیاں لانی تھی۔ بشیر انکل نے تاحال کرایہ نہیں دیا تھا۔ آج سات تاریخ ہو گئی تھی۔ عموماً" کرایہ پانچ تک لازمی آجاتا تھا۔ زارا نے کشور چچی کو سلایا اور سلانے سے پہلے دکان تک جانے کی اجازت مانگی جسے انہوں نے آنکھ کے اشارے میں دے دیا۔ گھر کی کنڈی باہر سے اٹکا کر وہ باہر نکل آئی۔

"یہ اب اس گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی!" جانے کہاں سے بازگشت سنائی دی۔

اب وہ آواز کہاں تھی؟ کہیں نہیں... کوئی بندہ کسی پر کوئی قید نہیں لگا سکتا۔ جب تک اللہ نہ چاہے۔ کبھی زارا نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس گھر کو سنبھالے گی۔ گھر میں چیونٹی کی حیثیت رکھنے والی اس گھر کو سنبھال رہی تھی۔ وہ آواز جو اسے مانوس بھی نہیں لگتی تھی۔ اب وہ اس آواز کے نکلنے سے پہلے ضرورت سمجھ جاتی تھی۔ وہ کہاں تھی اور کیا تھی۔ یہ معنی نہیں رکھتا۔ معنی یہ رکھتا ہے کہ اللہ نے کس لیے بھیجا ہے اور اللہ اب اس سے کیا کام لے رہا ہے! کیا بلقیس آنٹی سچ کہتی ہیں کہ مجھ پر اللہ کا رنگ چڑھ گیا ہے؟

اللہ معافی توبہ استغفار' میں کیا اور میری اوقات کیا؟ میں بھی کتنی خوش فہم ہوں۔ میری تنہائی بھی پاک نہیں اور میں اتنے اوپر کا سوچتی ہوں! پتا نہیں کیا سوچتے سوچتے وہ بشیر انکل کی دکان پر پہنچ گئی۔ بشیر انکل اسے دیکھ کر جی بھر کر شرمندہ ہوئے۔

"اوئے بچہ جمورا۔ ام کو معاف کرنا۔ ام ضرور تم کو کرایہ بھیج دیتا لیکن یہ جو نیا چھوکرا رکھا ہے اس کو ککھ سمجھ نہیں آتا۔ زرا جھلا ہے ویسے بڑی ایٹم مشین بنتا ہے لیکن ہے للو کا للو۔ سو دفعہ تمہارے گھر کا بتایا لیکن اس کو سمجھ ہی نہیں آتا۔ اماری ٹانگوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو بچہ جمورا ام کو زحمت نہ اٹھانی پڑتی!"

"اوہو کوئی بات نہیں انکل۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے بھی پیسے ضروری نا چاہیے ہوتے تو انتظار کر لیتی!"

زارا جانتی تھی انکل سچ بول رہے ہیں لہٰذا ان کو دوبارہ شرمندہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ "وہ چھوکرا ساتھ والی دکان میں مال کی سیٹنگ کر رہا ہو گا۔ اس کو جا کر بولو تم کو کرایہ دے گا۔ ہماری ٹانگوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو خود تمہارے ساتھ جاتا!"

زارا نے شکر ادا کیا۔ اسے پیسوں سے مطلب تھا۔ انکل کو اللہ حافظ کہہ کر ساتھ والی دکان میں داخل ہوئی۔ یہ دکان ایک طرح سے گودام بنی ہوئی تھی۔ اندر جانے کا رستہ بھی مشکل سے ملتا۔ یہ دکان ساتھ والی دکان کی نسبت چھوٹی تھی۔ ایک لڑکا پسینے سے نچڑتی قمیص میں سر پر تھان رکھے زارا کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

"بے چارہ ضرورت مند ہے۔ آج کل لوگ دال روٹی میں گزارا نہیں کرتے۔ اور سے اور کی لالچ کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ پتا نہیں کیسے اپنے پیاروں کو خوار ہونے بھیج دیتے ہیں!" یہ سوچتے ہوئے زارا نے سلام داغا۔

"السلام علیکم!" اس لڑکے کے سارے تھان سر سے گر گئے۔

"وعلیکم السلام۔" کہتے ہوئے مڑا۔

اس کے سامنے کوئی اور نہیں زین کھڑا تھا!

کچھ دیر دونوں گنگ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ انبساط کے سرور نے یکایک ان کو دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے درمیان میں سال دو سال کا وقفہ آیا ہی نہیں تھا۔ وہی زارا تھی وہی زین تھا۔ نظروں نے بتایا کہ ایک بھی لمحہ یا کوئی ایک بھی جملہ بھلایا نہیں گیا۔ نظروں کی پگڈنڈی پہ ہاتھ تھامے انہیں موسم کی سختی بھول گئی تھی۔ وہ صرف ایک دوسرے کی موجودگی کو خاموشی سے حفظ کر رہے تھے۔

"ان کی دید ہو گئی... ہماری عید ہو گئی!" زین نے شرارت کے ساتھ ابتدا کی تو زارا بری طرح سٹپٹا گئی۔

"مگر آپ کو پسند تو نہیں آیا ہو گا... ٹیچر جو رہ چکی

ں!"

زین نے اگلا جملہ پھینکا اور زارا کو واقعی جا لگا۔ اس کی آنکھوں کی شرارت نے زارا کو تپایا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟" زارا اسے یہاں دیکھ کر بری طرح حیران ہوئی۔

"وہ پاگل کر کے پوچھتے ہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ کوئی بتلائے گا یا ہم بتلائیں کیا؟" زین کے لہجے میں شرارت برقرار رہی۔ زارا کے چہرے پہ آوارہ سی لٹ اب بڑی ہو کر ٹھوڑی کو چوم رہی تھی۔ گزرتے سالوں نے اس کی معصومیت کو سونے رنگ کو کندن کر دیا تھا۔

"گرمی سر پہ چڑھ گئی ہے تمہارے۔ کرایہ دو میں نے گھر بھی جانا ہے!" زارا کو شہد رنگ آنکھوں کے ارتکاز سے کوفت ہوئی۔

"اسی لیے تو میں خود کرایہ دینے گھر نہیں آیا۔ میں آجاتا تو آپ نہ آتیں۔" زین پیچیدہ پہیلی کا انسانی شکل میں بھیجا گیا نمونہ لگا۔

ان دو سالوں نے اس کی بازوؤں کی رگوں کو تھوڑا اور نکھار دیا۔ اس کی کنپٹی سے بہتا ہوا پسینہ اس کی بھنوؤں کا صدقہ اتارنے لگا۔ ماہ و سال کی محنت اس کے روپ کو بدل چکی تھی۔ آج یہ لڑکا اسے چھوٹا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تو بھی اسے بچہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

دل سائباں کی خواہش میں ایک دم مچلا۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی لیکن کئی رنگ اس کے چہرے پہ آکر ٹھہر گئے۔ سامنے والا رنگوں کی اس دھنک سے کہاں انجان تھا... وہ تو ان رنگوں کی تتلیاں پکڑ کے اپنے دل کے باغ کو رنگین کرنے کا خواہش مند تھا۔

وہ کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن محبت اسے زارا کو زچ کرنے کی اجازت دیتی نظر نہیں آئی۔ اس نے خاموشی سے اپنی جیب سے کرایہ نکالا۔ جسے خاموشی سے ہی زارا نے لے لیا۔ خاموشی نے آج وہ کام کیا تھا جو اس سے پہلے زارا کا گریز نہ کر سکا' جو زین کی چلتی زبان نہ کر سکی۔

ان دونوں نے اس خاموشی کو دل کے مندر میں بجتی گھنٹیوں کے شور میں بخوبی سنا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ یخ بستہ چاندنی کے مسافروں کی طرح ٹھنڈے ہوئے۔ باہر چلتی گرم ہوائیں ان کے اندر کے موسم پہ اب ذرہ برابر بھی فرق نہیں ڈال سکتی تھیں۔

زارا دکان سے باہر نکل چکی تھی لیکن دل اچھل پتھل کرتا وہیں کہیں دکان میں ہی رہ گیا۔ اسے اچھا لگا کہ وہ اسے بھولا نہیں ہے۔ اسے اچھا لگا کہ آج بھی ویسے ہی جذبات رکھتا ہے۔ اسے اچھا لگا کہ وہ آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ یہ بات وہ اسے بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ آج وہ اسے واقعی اچھا لگا تھا!

حاصل عمر زار واپس آ' عشق ناکردہ کار واپس آ
کوچہ یار کا سکوں صد حیف اے دل بے قرار واپس آ

☼ ☼ ☼

کبھی یوں بھی تو ہو
دریا کا ساحل ہو
پورے چاند کی رات ہو
اور تم آؤ
کبھی یوں بھی تو ہو
پریوں کی محفل ہو
کوئی تمہاری بات ہو
اور تم آؤ
یہ نرم ملائم ٹھنڈی ہوائیں
تمہارے گھر سے گزریں
تمہاری خوشبو چرائیں
میرے گھر لے آئیں
کبھی یوں بھی تو ہو
سونی ہو محفل ہو
کوئی تمہاری بات ہو
اور تم آؤ
یہ بادل ایسا ٹوٹ کے برسے.

میرے دل کی طرح ملنے کو
تمہارا دل بھی ترسے
تم نکلو گھر سے
کبھی یوں بھی تو ہو
تنہائی ہو دل ہو
بوندیں ہوں برسات ہو
اور تم آؤ

زین ”اور تم آؤ۔۔۔ اور تم آؤ۔“ دھیمے سروں میں گنگنائے جا رہا تھا۔ لفظ اس کے لبوں سے نکلتے مسکراہٹ کی خوب صورت سی دھن میں تبدیل ہوتے رہے۔ یہ دھن جب سلطانہ نے سنی تو اپنی ایڑیوں پہ مڑیں۔ سلطانہ نے اپنے بیٹے کی بند آنکھیں دیکھیں تو ٹھہر کر اس کے چہرے کو یوں دیکھنے لگیں جیسے مسافت کو اپنی آنکھوں سے چننا چاہتی ہوں۔ یہ پاگل کتنی محنت کر رہا تھا۔ دن رات ایک کر رکھا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے سینکڑوں کورس ان ڈیڑھ دو سالوں میں کر چکا تھا۔

سلطانہ جب بھی اس کے گھر رشتہ لے کر جانے کا کہتیں زین ہمیشہ منع کر دیتا۔

”اب دونوں کے پاس ٹھوس وجوہات ہیں۔ اس کو اپنی چچی کی فکر کھائے گی وہ ہاں نہیں کرے گی اور مجھے اب ضد ہے اس کو ویسے ہی لاؤں جیسے اسے لانا چاہیے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ ہو!“ وہ کہتا۔

سلطانہ آگے سے چھیڑنے کو کہتیں۔

”اتنا خیال تو کبھی تو نے میرا بھی نہیں رکھا!“

زین پریشان ہو جاتا۔ اپنی ماں کو خفا کرنا اس نے سیکھا ہی کہاں تھا۔

”آپ تو ماں ہیں نا اور ماں کی محبت۔۔۔ میں نے کیا اس دنیا میں سب ہی نے یوں لی ہے جیسے پچھلی صدیوں میں کہیں کسی روپ میں ماں کو قرضہ دے رکھا ہو۔ ماں کی محبت کو ٹیکن فار گرانٹڈ لیا جاتا رہا ہے اور لیا جاتا رہے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں آپ کی محبت کو سمجھتا نہیں ہوں۔ لیکن اس کا صلہ دینا ممکن ہی نہیں۔ ساری زندگی کم ہے آپ کا احسان اتارنے کے لیے!“

سلطانہ ان باتوں پہ مسکرا دیتیں تو زین کی ساری ہستی یوں ہوا ہو جاتی جیسے دیگچی سے ڈھکن اٹھاؤ تو اس کی ساری بھاپ بخارات بن کر ہوا ہو جاتی ہے۔ دیگچی کے ڈھکن کی طرح نم دیدہ ہو جاتا۔ ایسی ماں کی محبت، جس نے باپ کی شفقت سے بھی نوازا ہو، واقعی کوئی صلہ نہیں دے سکتا تھا۔

”زین بیٹا تھک جاؤ گے!“ سلطانہ نے آنکھیں موندے لیٹے بیٹے کو فکر مندی سے دیکھا۔

”اس کا چہرہ تھکنے نہیں دیتا اماں!“ زین نے آنکھیں کھولیں اور آنکھوں میں بھی مسکراہٹ کی دھنیں رقصاں نظر آئیں۔

”ملی وہ؟“ سلطانہ مارے اشتیاق کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”اللہ نے ملوا دیا!“ زین نے محکم یقین سے جواب دیا۔ پھر ماں کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ شوخ ہوا۔ ”اماں آپ اتنی ماڈرن کیسے ہیں؟“

”میں نے کیا ماڈرن ازم دکھا دیا ہے تجھے؟“ سلطانہ نے اچنبھے سے پوچھا اس سے ان کا ہاتھ ناک کی لونگ پر تھا جس کی چمک ممتا کی سانولاہٹ سے کہیں دور تھی۔ زین نے دل ہی دل میں نئی لونگ لینے کا سوچا۔

”اماں ماڈرن ازم ہی تو ہے ایسے ہی تو آپ کو زارا کی چچی نے نہیں کہا تھا نا؟“ وہ سخت شرارت پر آمادہ ہوا۔

حسب توقع اماں ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

”ہاں بھئی جو عورتیں دوستیاں کرنے کی اجازت دیتی ہیں، بیٹے کو تحفے بٹورنے دیتی ہیں، آنکھیں بند رکھتی ہیں، وہ ماڈرن نہیں ہیں۔ میں جو تیرے سیدھے راستے پہ مان گئی۔ میں ماڈرن ہوں۔ تجھے بڑا یاد ہے زارا کی چچی نے کیا کہا مجھے؟ پتر بچی بات کر کل کو زارا گھر آئے گی تو مجھے بازو سے پکڑ کر باہر تو نہیں نکال دے گا؟“ زین کا قہقہہ ابل پڑا۔

”ماں کو تھوڑا سا زچ اور تنگ کر کے جو مزا ملتا ہے مزا دوستوں کی ٹانگ کھینچنے میں بھی نہیں ملتا۔“ اماں اب چارپائی سے کھڑے ہو کر زین کو دیکھنے لگیں۔ اس سے پہلے ان کی چپل اترتی اور زین کی کمر سینکی جاتی۔

وہ فوراً بولا ”ہائے اماں مذاق کر رہا ہوں۔۔۔ زارا آئے گی تو آپ کو بازو سے پکڑوں گا ضرور لیکن گھر سے باہر نکالنے کے لیے نہیں بلکہ سکون اور آرام دینے کے لیے!“ اماں بے چاری پھر بیٹھ گئیں۔

مائیں کیا ہوتی ہیں؟ روبوٹ جس کا ہر بٹن اولاد کے ہاتھ کے اوپر انحصار کرتا ہے۔ اولاد خوش تو ماں خوش۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ انسان ضرور بنایا ہے لیکن ان کی اپنی کوئی مرضی کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ بس اولاد کی خوشی میں ہنسنا اور اس کے غم میں رونا!

”تجھے پتا ہے زین میں دل کو بڑا کر کے گئی تھی زارا کے گھر۔۔۔ جب زارا کو دیکھا تو یوں لگا جیسے پتا نہیں کب سے اسے ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ بیٹا پیدا ہوتا ہے تو ماں کا دل بڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے حوالے سے بہت سے خواب دیکھتی ہے۔ میں نے بھی خواب دیکھے۔ اپنے لیے سیدھی اور بھولی بھولا نے کا خواب۔۔۔ زارا ایسی ہی ہے۔۔۔ آنکھیں مٹکانا یا چال بنانا اسے ذرا بھی نہیں آتا۔ بس اللہ لوک سی ہے۔ جدھر ہوائیں موڑتی ہیں ادھر مڑ جاتی ہے۔ آنکھوں میں شرم ہے، حیا ہے۔ اگر مجھے پسند نہ آتی تو میں کسی طرح تجھے اس سے ہٹا دیتی۔ اس نے تجھے کتنی اچھی مت لگائی ہے۔ اس کی محبت نے تجھے سیدھا بندہ بنایا ہے۔ یہ محبت ہی تو ہے جو بندے کو بے پر کے اڑا دیتی ہے۔ اختتام پہ صرف اوج کمال نصیب ہوتا ہے۔ کوئی کتنا بھی اڑیل کیوں نہ ہو محبت ناک میں نکیل ڈال کر اسے بندے کا بچہ بنا دیتی ہے۔“

”اماں اس کی آنکھیں آپ کے سامنے اٹھیں آپ کو لگ پتا جائے۔ پتا ہے اتنی بڑی آنکھیں نکال کر مجھے گھورتی ہے!“ زین نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور یہ اشارہ مبالغہ آرائی کی حدوں سے بھی پرے نکالا۔

”وہ سچا موتی ہے۔ وہ پارس ہے اسی لیے تو آپ کا پتر کملا ہو گیا ہے۔ مجھے پتا ہے وہ اس گھر کو جنت تو بنا سکتی ہے۔ دوزخ کبھی نہیں بنائے گی۔ اماں لوگ کہتے ہیں ناں محبت اندھی ہوتی ہے۔ محبت اندھی نہیں ہوتی۔ جو لوگ صرف شکل دیکھ کر محبت کرتے ہیں یا پیسے پر نظر رکھتے ہیں، ان کی محبت اندھی ہوتی ہے اور جب بینائی لوٹتی ہے تو ساری زندگی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سسکنے لگتی ہیں۔ جو محبت کسی کی فطرت، کسی کی سادگی کو دیکھ کر کی جائے وہ اندر باہر جل تھل کر دیتی ہے۔ من کے میل کو اتنا دھوتی ہے کہ بندہ اپنے دل کی ہر بات بس ایک نظر میں دیکھ کر جان لیتا ہے ورنہ تو ساری عمر مخمصے میں مبتلا رہتا ہے۔ نہ خود کو جان پاتا ہے نہ کسی اور کو پہچان پاتا ہے!“ زین کہتا رہا۔ سلطانہ اس کی آنکھوں کی چمک کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہیں۔

محبت جہاں بھی سر اٹھائے کھڑی نظر آتی ہے اس کے ماننے والے ہاتھ باندھے پہنچ جاتے ہیں۔ کوئی ان کو بھوکا کہے تو بھوکا ہی سہی، کوئی پاگل کہے تو پاگل ہی سہی، کوئی بے وقوف سمجھے تو بے وقوف ہی سہی۔ محبت کی وجہ سے ملنے والے سارے خطاب ماتھے پہ لگا لینے کا دل کرتا ہے۔ محبت کا ملنا، محبت کو دیکھنا، محبت کو محسوس کرنا ہر شے پر حاوی ہوتا ہے۔ ان محبت کے بھوکوں کو پتا ہوتا ہے محبت چودھویں کے چاند کی چاندنی ہے۔ مخمور سی چاندنی جو روشن کرے گی! محبت بہتے جھرنوں کی ٹھنڈک ہے جو روح کو پر سکوں کر دے گی!

محبت پرندوں کی **نغمگی** ہے جو سماعتوں میں امرت رس گھول دے گی!

پرندے اپنے نغموں کے سرور میں کھوئے ہوئے اپنے پر پھیلاتے اور سمٹتے افق کی نیلگوں روشنی پہ اپنا حق جتاتے رہے۔

جس تن لگیاں عشق کمال
ناچے بے سر تے بے تال

✡ ✡ ✡

دیکھ بندیا اسماناں تے اڈدے پنچھی
ویکھ تے سہی کی کر دے نے
ناں او کر دے رزق ذخیرہ
ناں او بکھے مردے نے
کدی کسی نے اڈدے پنکھ پکھیرو
بکھے مردے دیکھے نے؟

بندے ہی کر دے رزق ذخیرہ
بندے ہی بکھے مر دے نے

گھر کے دروازے پہ پہرہ دار نہیں رہا تھا۔ رنگ رنگ کے لوگ آنے جانے کی کوشش کرتے۔ کسی کو کسی کام کے لیے گھر بلاتی تو دکانوں کی لالچ میں کوئی اور بن سنور کر دوڑا چلا آتا۔ زارا دامن بچاتی، کبھی شیر کی طرح دھاڑتی، کبھی ناگن کی طرح پھنکارتی۔ اپنے آپ کو سمیٹے اپنے اندر بیٹھی رہتی۔

کچھ ناک گھسانے کی عادت اس دکان دار کی بھی تھی جو اس کی اپنی دکانوں میں رہتا تھا۔ وہیں پلاسٹک کا مال بیچتا۔ وہیں گدھے گھوڑے بیچ کے سویا رہتا۔ ایک دفعہ گھر آکر کرایہ دینے کی کوشش کی۔ یوں لگتا تھا جوتوں سمیت آنکھوں میں گھر جائے گا اور حیا کو برہنہ کر کے ہی دم لے گا لیکن بھلا ہو بلقیس آنٹی کا کہ اس وقت گھر پر موجود تھیں۔ آگے بڑھیں، کرایہ لیا، اس آوارہ کو چلتا کیا اور ساتھ تنبیہہ بھی کی کہ آئندہ میں خود کرایہ لینے آؤں گی۔ اس کے بعد ان کی مہربانی خود ہی دکان پر چکر لگا لیتیں اور کرایہ دے جاتیں۔

اس بار مہینے کی پندرہ ہونے کو آئی تھی۔ کرایہ گھر نہیں آیا تھا۔ بلقیس آنٹی بھی گاؤں نکل پڑیں۔ بھلا فوتگی ماتم بھی چھوڑے جاتے ہیں۔ شبیر انکل کی دکانوں کے کرائے سے بمشکل گھر کی دیواروں پہ سیمنٹ کی لپائی کی تھی۔ دروازے کی کنڈی بازی کی۔ موٹر ٹھیک کروائی۔ چھوٹا سا کولر خریدا اور باقی علاج پہ اٹھ گئے۔ اب کھانے کو گھر میں آٹا موجود لیکن پکانے کو سالن ندارد تھا۔

دل سے آواز آئی۔ ہاں کرایہ لے آؤ۔ ساتھ اسے بھی دیکھ آنا، وہیں ٹکا ہوا ہے۔

دماغ نے کہا۔ اب ذرا جا کر دکھاؤ۔ تمہاری اپنی غرض شامل ہے۔ روٹی سالن سب بہانہ ہے۔ تمہیں تو دیدار کرنے کروانے جانا ہے۔ پیٹ نے بحث میں حصہ لیا۔ عقل نے نظر کے ہاتھوں مار کھائی۔ کشور چچی کی بے چارگی جیت گئی۔ بڑی سی چادر اوڑھی اور دکان پر چلی گئی۔ یہ دکان اور شبیر انکل کی دکان بس آمنے سامنے ہی تھی۔

"میں کرایہ لینے آئی ہوں۔" پلاسٹک کی دکان والے ظہور سے سپاٹ لہجے چہرے کے ساتھ مطالبہ کیا۔

"یہی ذرا مسکرا کر مانگ لو تو کرائے سے زیادہ پیسے وار دوں!" اس کی آنکھوں میں خبیث ایکسرے مشین نظر آئی۔ زارا کو لگا وہ چھلنی ہو رہی ہے۔

"بھیک مانگنے نہیں آئی، کرایہ مانگنے آئی ہوں!"

اس نے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے لیے چادر مزید مضبوطی سے تھام لی۔

کتنا مشکل ہوتا ہے۔۔۔ نازک جسم کی نزاکت چھپانا، آنکھوں کے کٹوروں میں ڈر کے دستک دیتے قطرے چھپانا، پاؤں کے انگوٹھے میں چلاتے ہوئے اضطراب کو چھپانا! ظہور کاؤنٹر سے اتر کے عین سامنے کھڑا ہوا۔ اطوار ٹھیک نہ لگے۔ ضرور وہ پیسے ہاتھ میں تھمانے کے بہانے کوئی خباثت کرنا چاہتا تھا۔ زارا کے پیر کے تلوؤں تک پسینہ آگیا۔

"مجھے دے دو!" زین نے ظہور کے ہاتھ سے پیسے یکبارگی لینا چاہا ہے۔ وہ فرشتے کی طرح وارد ہوا۔ ظہور سخت بدمزا ہوا۔ زارا کی جان میں جان آئی۔ پسینہ کچھ خشک ہوا۔

"کیوں بھئی صرف تم ہی حسن کے لشکارے دیکھو؟ کھلا مال ہے۔۔۔ ہمارا بھی حق ہے!" زارا کو لگا وہ بھرے بازار میں ننگی سر کھڑی ہے۔ اس سے پہلے کہ آنسو اس کی پلکوں کی باڑ بھگوتے اس نے ظہور کو مٹی چاٹتے دیکھا۔ زین اسے گھونسا مار چکا تھا۔

"بکواس کرتے ہو؟ جانتے ہو کون ہیں؟ ان کے چچا عرصہ دراز تک مسجد کی خدمت پر مامور رہے ہیں!" زین دھاڑا۔ ظہور کی آنکھوں میں شرمندگی جھانکی۔ ایک زندہ لڑکی سے زیادہ اینٹ گارے کی عمارت شرم دلانے کو کافی ہو جائے تو وہ معاشرہ کہاں کھڑا ہوتا ہے؟ اپنے پاؤں پر کھڑا تو بہر حال نظر نہیں آتا۔ زین نے ظہور کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے پیسے لیے اور زارا کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"چلو!" اشارہ بشیر انکل کی دکان کی طرف تھا۔ وہ ساتھ چل دی۔

"تمہیں گھر سے نکلنے کو کون کہتا ہے؟" زین نے خفگی سے پوچھا۔

"یہ تم کیسی محبت کرتے ہو مجھ سے؟ رسوا کر کے چھوڑو گے مجھے؟" زارا چڑھائی کو تیار نظر آئی۔

"تو کیا کرتا اسے پھولوں کی مالا پہناتا؟" مذاق بنایا ہوا ہے تم نے؟ اٹھ جاؤ تو محبت نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ تو محبت ہے۔ لیٹ جاؤ تو محبت نہیں ہے۔ سو جاؤ تو محبت ہے۔ بڑی عجیب تعریف ہے تمہاری محبت کی۔ ادھر دیکھو میری طرف؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اف کر دیا تڑف۔۔۔ محبت محبت ہے!" زین نے باقاعدہ ناراض ہوتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو سہلایا۔ جوش میں آکر مکا تو مار دیا لیکن سیدھے اس کے دانت ہاتھ پر لگے۔

"پتا نہیں کس لوہے کا دندانہ استعمال کرتا ہے ظالم کا بچہ۔۔۔ ہاتھ چھیل کر رکھ دیا!" وہ دل ہی دل میں ظہور کو کوستا، زارا سے ہاتھ چھپاتا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ دیکھ لیتی تو ہنس پڑتی یا مذاق ہی بن جاتا کہ ٹھیک سے کھڑے ہو کر ایک مکا بھی نہیں مار سکتے۔ اور اگر مار ہی لیا تو اب ہاتھ سہلا رہے ہو۔

شبیر انکل بھی اپنی جگہ پر منتظر کھڑے نظر آئے۔ دونوں کو اندر آتا دیکھ کر زارا کی طرف متوجہ ہوئے۔

"بچہ۔ جو زارا تم ہمارے پاس آتا ہم تم کو کرایہ لے دیتا۔" پھر اپنا چہرہ زین کی جانب موڑا۔ "چھوکرے تم کیوں لڑنے پر اتر آیا؟"

"چاچا دماغ نہ خراب کرو۔ تم مری کی چڑھائیاں چڑھ جاتے ہو لیکن ان محترمہ کے گھر کرایہ دیتے ٹانگیں درد کرتی ہیں۔ ہر مہینے ظہور کا اور اپنا کرایہ خود جا کر دیا کرو۔ میں دوبارہ اسے بازار میں نہ دیکھوں!" زین کے الفاظ میں اتنا دبدبہ تھا کہ جیسے وہ اس دکان کا مالک ہو اور انکل شبیر اس کے ملازم!

انکل شبیر بھی اس کے رنگ حیرت سے دیکھتے رہے پھر زارا کو دیکھ کر لحاظ کر گئے۔ کہنا تو چاہتے تھے یہ اس دن تم نے ہی منع کیا تھا کہ آپ کی ٹانگیں درد کریں گی۔ آپ کرایہ دینے نہ جائیں۔ میں راستہ سمجھ کر خود لے جاؤں ورنہ وہ خود آجائے گی جسے ضرورت ہے۔ لیکن کالی دال نے منہ بند کروا دیا۔

"اور تمہیں میں دوبارہ بازار میں گھومتا ہوا نہ دیکھوں!" وہ دوبارہ زارا کی طرف گھوما۔

"میرا دماغ خراب ہو گیا تھا جو تمہاری بکواس سننے یہاں آگئی۔ مجھے کرایہ دو!" زارا پیر پٹختے ہوئے بولی۔

زین نے مسکرا کر اس کی ہوا بھرتی ناک کو دیکھا اور کرایہ آگے کیا۔ زارا نے تقریباً "کرایہ چھینا اور جاتے جاتے پتا نہیں کیسے اس کا رومال وہیں گر گیا۔

زین نے انکل شبیر سے آنکھ بچاتے ہوئے رومال اٹھایا اور ہنستے ہوئے ہاتھ پر باندھ لیا!

☼ ☼ ☼

یقین

سائیاں ذات ادھوری ہے، سائیاں بات ادھوری ہے
سائیاں رات ادھوری ہے، سائیاں مات ادھوری ہے
دشمن چوکنا ہے لیکن، سائیاں گھات ادھوری ہے
سائیاں رنج ملال بہت، دیوانے بے حال بہت
قدم قدم پر جال بہت، پیار محبت کال بہت
اور اس عالم میں سائیاں، گزر گئے ہیں سال بہت
سائیاں ہر سو درد بہت، موسم موسم سرد بہت
سائیاں میرے درد گھٹا، سائیاں میرے زخم بجھا
سائیاں میرے عیب مٹا، سائیاں کوئی نوید سنا
اتنے کالے موسم میں، سائیاں اپنا آپ دکھا

وہ آج بہت خوش تھا۔ وہ اس معاشرے میں سالوں بھی جتا رہتا تو بہتری مشکل تھی۔ آمدن کم سے کم ہو جاتی اور اخراجات زیادہ سے زیادہ۔ اس کے خیال میں نجات کا ذریعہ یہی تھا کہ وہ اس ملک سے نکل جائے۔ آج اسے یہ موقع ملا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

"اماں میں بہت خوش ہوں!" وہ خوشی سے تمتماتا چہرہ لیے گھر میں داخل ہوا۔

"اللہ تجھے خوش رکھے۔ زارا سے تو نہیں ملوایا۔ تجھے اللہ نے؟" سلطانہ نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے پوچھا۔

"زارا سے ہمیشہ کے لیے ملوانے کا بندوبست کر دیا ہے اللہ نے!" وہ خوشی سے بولا۔

"مطلب کوئی لاٹری نکل آئی ہے۔" سلطانہ اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گئیں۔

"اماں باہر ملک کا بندہ ہے۔ مجھے باہر ملک لے جائے گا۔ یہاں کے روپے پیسے سے دگنا کماؤں گا۔ یہاں کے پیسوں کی کیا عزت ہے؟ وہاں کا پیسا جب یہاں بدلے گا تو مزید پانچ سال پیسے جوڑنے کے بجائے چھ مہینے میں تیری بہو کو لے آؤں گا!" زین تھوڑا ہچکچایا لیکن سارا مدعا بیان کر ہی دیا۔

"زین تجھے پتا ہے میرا تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔ تونے جو کرنا ہے یہیں کر۔ اسی ملک میں کر۔ تجھے جو رزق ملنا ہے وہ یہاں بھی وہی ملنا ہے۔ اور وہاں بھی وہی ملنا ہے۔ کرنسیوں کا فرق ہے تو ہوا کرے۔ خدا کا فرق تو نہیں ہے نا۔ تیری ہر ضد میں نے مانی ہے۔ اب میری برداشت سے زیادہ نہ آزما مجھے!" سلطانہ زین کی توقع سے زیادہ سنجیدہ اور ناراض نظر آنے لگیں۔

"اماں آپ نے ایک بات کی تو اجازت دے دی ہے تو دوسری کی بھی دے دیں۔ زارا کو پانے کے لیے صرف اجازت ہی تو کافی نہیں ہے ناں۔ مجھے اس تک پہنچنا بھی ہے۔ اس تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے!" زین گھٹنوں میں آکر بیٹھ گیا۔

"اگر یہی راستہ ہے تو پھر اسے چھوڑ دے!" سلطانہ کا دل بھی کہتے ہوئے کانپا۔ وہ کچھ بھی برداشت کر سکتی تھیں بیٹے کی جدائی کیسے برداشت کرتیں۔ اس نے زین کا سب سے بڑا خواب توڑنے کی کوشش کی۔

"اماں مجھے مرا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں؟" زین بضد ہوا۔

"دیکھ سکتی ہوں؟ یہ کیسے سوال پوچھ رہا ہے؟ میرا دل ہول رہا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا کہ تجھے جانے دوں۔ تیری بات سنتے ہی میری آدھی سانسیں میرے اندر گھٹ گئی ہیں۔ مجھے تجھے دیکھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ سارا دن تیرے آنے کا انتظار کرتی ہوں مجھے کیسا انتظار تمھارا رہا ہے؟ میں کیسے رہوں گی؟" سلطانہ اپنی بات پہ مصر رہیں۔

"اماں اگر پیسے زیادہ کمانے ہیں تو مجھے باہر جانا ہی ہو گا۔ مانا خدا ایک ہے لیکن عمان کے ریال کا مقابلہ کسی بھی صورت پاکستان کے روپے سے نہیں کیا جا سکتا۔" ماں کو سائیکل کے لیے کی جانے والی ضد یاد آئی تب بھی ماں نے ہتھیار ڈالے تھے۔

مائیں بھی کبھی بیٹوں سے جیتی ہیں؟

جیت ہی نہیں سکتی۔۔۔ مائیں جو ہوتی ہیں!

"جا تیرا رب راکھا میں کیا کر سکتی ہوں؟ ہٹ پیچھے تجھے روٹی لا کر دوں!" سلطانہ اسے ہٹا کر چولہے کے پاس گئیں۔

اسے امید تھی کہ زین پیچھے سے آئے گا' گلے میں بازو ڈال کر کہے گا۔ اچھا اب نہیں جاتا۔ اب نہیں کہتا۔ میں خود بھی تو تیرے بغیر نہیں رہ سکتا! لیکن اس دن پہلی بار سلطانہ کی امید ٹوٹی۔ زین اس دن پہلی بار اپنی بات سے نہیں ہٹا۔

واقعی زندگی میں بہت سی چیزیں بہت سی باتیں پہلی بار ہوتی ہیں اور بہت مشکل سے برداشت ہوتی ہیں۔ بعض اوقات انجام تک پہنچتے پہنچتے یہ سب چیزیں اتنی بھیانک ہو جاتی ہیں کہ انسان ان کے کبھی نہ ہونے کے لیے "کاش کاش" کرتا رہ جاتا ہے۔

فلک نے معصوم پرندوں کی من مانی پرواز کو بے حوصلہ آنکھوں سے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

ریڑھی والا مکمل سر لگا کر اپنی سبزی بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زارا نے مکمل کان لگا کر سنا تو بھنڈی توری کی آواز آئی۔ وہ فورا" دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ سبزی والے سے سبزی لی۔ گلی سنسان تھی۔

ان گرمیوں میں انسان کو یا زمین کھا جاتی ہے یا آسمان۔ باقی ماندوں کو گھر نگل لیتے ہیں۔

گلی کے سینے پہ کوئی مونگ دلتا دکھائی نہیں دیا۔ سبزی والے کے پاس دھنیا سبز مرچیں پودینہ ٹماٹر پیاز بھی نظر آیا۔ زارا نے سب خرید لیا۔ شاپر دروازے میں رکھتی گئی۔ سبزی والے کا حساب چکتا کیا۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو پہلے دو لفافے لے کر باورچی خانے میں رکھے۔ پھر باہر گئی مزید شاپر اٹھائے اور انہیں بھی لا کر باورچی خانے میں رکھا۔ واپس دروازہ بند کرنے آئی تو دروازہ پہلے سے بند تھا اور زین سامنے کھڑا تھا۔ زارا اسے دیکھ کر سہم گئی۔

"بدلہ لینے آئے ہو؟" زارا نے ڈر پر قابو رکھ کر اس سے پوچھا۔

"بدلے تم سے لے ہی نہیں سکتا۔ میری پاس تمہارے جیسے نمکین نقش تو ہیں نہیں جن کو آنکھیں چکھنے کے بعد کسی اور شے کو دیکھنے سے منکر ہو جاتی ہیں۔ میرے بال بھی تمہاری زلفوں جیسے نہیں جنہیں دیکھ کر دل ان کی چھاؤں میں عمر بتانے کا سوچے۔ میری موجودگی تمہاری موجودگی کی طرح ست رنگی پھول نہیں کھلاتی۔ جیسے تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کلیاں چٹخنے لگتی ہیں ویسے تمہارے دل کی دہلیز پہ روشنی کی کرنیں دستک نہیں دیتیں۔ میں آپ کا غلام میری اتنی مجال کہ ملکہ عالیہ سے بدلہ لوں۔ ویسے کس بدلے کی بات کر رہی ہو؟" اس نے قریب ہوتے ہوئے جانثاری سے کہا۔

زارا دو قدم پیچھے ہوئی۔

"وہ جو اس دن دکان میں ہوا!"

"ہاں اس کا بدلہ لینا تو بنتا ہے لیکن کیا یاد کرو گی۔ معاف کرتا ہوں۔" زین متضاد بیان دیتا دو قدم مزید اس کی طرف بڑھانے لگا۔ اس گھر میں یوں آنے کی جرات کوئی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ کوئی اور نہیں تھا۔ وہ زین تھا!

"او ہیلو میں نے معافی نہیں مانگی۔ اگر رعب جھاڑو گے تو یہی سنو گے کہ تمہاری بکواس سننے یہاں نہیں آئی۔ بالکل ٹھیک کہا تھا اس دن میں نے۔ تمہیں منع کیا تھا کہ مجھے نہ دیکھنا پھر کیا لینے آئے ہو!" زارا تلخ ہوئی۔

"آج تو اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے دیکھ لو!" دو قدم بڑھاتے وہ اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ اب زارا پلکیں اٹھانے کی ہمت ڈھونڈنے لگی۔ اوپر سے چچی کی نیند ٹوٹ جانے کا بھی خدشہ بھی منہ کھولے نظر آیا۔

"کس خوش فہمی میں آئے ہو؟" زارا نے ابرو اٹھا کر خود ایک طرف سے نکلنے کی کوشش کی۔ وہ راستے میں آگیا۔

"میں جا رہا ہوں!" آواز تھی یا سیسہ۔۔۔ ڈر بہت سی تہیں توڑتا ہوا لاوے کی طرح باہر آیا۔

"میں نے کہا تھا ناں تم چلے جاؤ گے!" یہ کہنے والی زارا نہیں تھی۔ یہ ڈر تھا! ڈر ان آنکھوں کے سامنے کھڑا سوال کرنے لگا۔

"تم مجھے ایک دفعہ بھی کہہ دیتیں تو نہ جاتا۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ تم نے کہا نہیں!" زین اس کی بات سن کر ان کہے جملے جان گیا۔ اس کی بازوؤں کی نمایاں رگیں مزید تن گئیں۔ اندر شورش برپا تھی۔

وہ ساری باتیں جو زارا نے کبھی نہیں کہی تھیں زین نے محسوس کر لیں۔ وہ سب اس لمحے زین کو سمجھ آ گئیں۔ اب زارا خاموش رہی۔

"سچ بتاؤں تو صرف آٹھ ماہ کی بات ہے۔ ابھی اماں کو نہیں بتایا آٹھ ماہ میں واپس آجاؤں گا۔ تمہیں یہیں اپنا منتظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ لو چوڑیاں۔ کانچ کی ہیں لیکن لوہے کی سمجھنا۔ زنجیر سمجھتی ہو؟ زنجیر گردانو۔۔۔ کسی اور کا بڑھا ہاتھ تھامتے ہوئے دیکھ لیا تو اپنی جان سے بھی جاؤں گا اور تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا انتظار کرو گی نا؟" وہ ایک لمحے کو سلطان راہی بنا اور آخر میں پھر وحید مراد! اسے الوداع کہنا زین کو بہت مشکل لگ رہا تھا۔ اسے خود اپنی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

محبت کیسے روپ بدلتی ہے۔ کبھی ملکیت جتانے لگ جاتی ہے۔ کبھی پیروں میں لوٹتی ہے۔ محبت بس تجدید مانگتی ہے۔ یقین مانگتی ہے۔ اپنے ہونے کا احساس مانگتی ہے۔ محبت چاہتی ہے کہ محبوب محبت

پہن لے، محبت اوڑھ لے۔ محبت کی زبان میں بات کرے۔ محبت لکھے، محبت پڑھے، محبت سمجھے، محبت کا راگ الاپے۔ محبت آنکھوں میں بینائی بن کر اترے۔ محبت آواز میں سوز بن کر نکھرے۔ محبت جھلا کردے اور اس سارے جھلے پن کی بے قراریوں کو بیان کرنے میں لمحے کم لگنے لگ جاتے ہیں!

زارا نے بمشکل اپنے دل کی بدتمیزیوں سے منہ چھپایا اور اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہیں لگتا ہے میں تمہارا انتظار کروں گی؟" اپنا انداز دیکھا ہے؟ محبت میں جبر کیسا؟"

"محبت کے قاعدے نہ پڑھایا کرو۔ اپنے اندر کی استانی سے چھٹکارا پاؤ۔ بیوی بننے کی تیاری کرو۔ ہاتھ بڑھاؤ اور محبت تھام لو۔" زین نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنی طرف کیا۔ وہ اب اس کے ہاتھوں میں کانچ کی کالی چوڑیاں پہنانے لگا۔ گرمی سے بہہ نکلنے والے پسینے میں ایسی ٹھنڈک سمٹ آئی کہ شبنم گمان ہونے لگا۔ زارا ہاتھ نہ کھینچ سکی وہ آرام سے کلائی تھامے چوڑیاں پہناتا رہا۔

ایک آنسو زارا کی بائیں آنکھ سے نکلا۔ گال پر پھیلا۔ زین نے انگلی کی پور پہ چنا!

"یہ آنکھ لیک تو نہیں کرتی؟" اس نے مذاق کرنے کی بھونڈی سی کوشش کی۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہنسا۔

"اللہ انتظار کروائے گا اور پھر اللہ ہی ملوائے گا۔"

زین نے زارا کے ہاتھ کی پشت تھپکی اور باہر نکل گیا۔ وہ کچھ لمحے بھی اور ٹھہرتا تو پتھر کا ہو جاتا۔ یہ لڑکی اپنی سادگی میں بھی اسے امتحان میں مبتلا کر دیتی تھی۔ روشنی جب جاتی ہے تو کیسا اندھیرا چھوڑ جاتی ہے۔ زارا کو آج وہ اندھیرا نظر آیا۔

کوئی سانپ تھا کہ جس کا پھن دماغ میں پھنکارنے لگا۔ اس نے ڈر کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن محبت نے یقین تک کے سفر میں آنے والی آزمائش نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

خاموشی ناچتی رہی۔۔۔

ڈر پھنکارتا رہا۔۔۔

محبت سر اٹھانے کی کوشش کرتی رہی۔۔۔

اور۔۔۔

یقین سر پٹختا رہا!

☆ ☆ ☆

وہ آیا ہی کیوں تھا میری زندگی میں۔۔۔ وہ یہ سوال کرتی جاگتی اور یہی سوال کرتی سو جاتی۔ اس کی باتوں میں یہ سوال کانٹا بن کر چبھ گیا۔ تکلیف کے احساس سے وہ سوئی جاگی سی ہو گئی۔ اس کی کالی آنکھوں میں وحشت کے سائے ناچنے لگے۔ زلفیں جنہیں وہ بادل کہہ کر گیا تھا اس سوال کی بازگشت سے اڑنے والی خاک سے اٹ گئیں۔ وہ اس کو آخری دفعہ نہیں کہہ سکی تھی کہ وہ اسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تھوڑا سا اظہار اس بے حوصلہ آنسو نے کر ہی دیا تھا۔ کیا اس بے حوصلہ آنسو نے مجھے بے مول تو نہیں کر دیا؟ میرا یہ آنسو اس کو مغرور تو نہیں کر دے گا؟ مغرور تو کبھی واپسی کے راستوں پہ قدم نہیں رکھتے۔ خود ہی سوال کرتے اور خود ہی جواب دیتے وہ اپنی لٹ کو سلجھانا بھولنے لگی۔ پانچ مہینے گزر گئے تھے انتظار کرتے کرتے

کشور چچی کافی حد تک بہتر ہو گئیں۔ معالج کی ادویات نے کام دکھایا اور باقی کسر دعاؤں نے نکال دی۔ پھر بھی احتیاط لازمی تھی ان کو دوبارہ اٹیک ہونے کا خطرہ تھا۔ ان کے بہتر ہونے سے زارا کو وقت ملا اور یہ وقت ہی تو مصیبت بنا۔۔۔ کٹتا ہی نہیں تھا!

زارا روز سیڑھیوں پہ بیٹھ کر اپنی چوڑیاں گنتی۔ پوری چھتیس تھیں۔ اس نے جب بھی گنیں۔ وہ چھتیس ہی رہیں۔ ایک دن سیڑھیوں سے صفائی کرتے ہوئے وہ لڑکھڑا گئی۔ ایک بازو نے نیچے لگنا تھا۔ اگر دایاں بازو نیچے لگتا چوڑیاں ٹوٹ جاتیں۔ وہ بائیں بازو کے سہارے گری اور بازو چھل گئی لیکن وہ خوش تھی کہ چھتیس چوڑیاں پوری رہیں!

آخر چھٹے مہینے کسلمندی نے اپنی زنجیریں خود ہی توڑیں۔ زارا اپنی فطرت میں جاگ اٹھی شوخی کی سرمستی سے محظوظ ہوتی رہی۔ اس نے مہندی گھولی۔ اپنے بال رنگے کہ دھوپ میں چمک اٹھیں۔ وہ ہمیشہ دھوپ میں سائے کی طرح ہی تو ملا کرتا تھا۔ اس نے مالٹے کے چھلکے پیسے انہیں دودھ میں ملا کر گالوں پہ لگاتا تھا۔ ہاتھوں پیروں پہ دودھ ملائی کا مساج ہونے لگا۔

اماں کے صندوق سے دو نئے جوڑے نکال کر سی لیے۔ پتا نہیں کرنے کو اتنے کام کہاں سے نکل آئے کہ آٹھواں مہینہ بھی سر پر آگیا۔

وہ تیار تھی۔ مکمل تیار۔ اس کے انتظار نے اشتیاق کا لباس پہن لیا!

کسی کے اسی شہر میں ہونے سے ہوا میں آکسیجن کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ زارا کو ایسے سارے غیر منطقی فلسفے ان مہینوں میں سمجھ آگئے۔ نہیں سمجھ میں آیا تو صرف یہ کہ آخری مہینہ کیسے گزرے گا۔

اس کے کرنے کو کچھ بھی نہیں بچا تھا کیوں کہ وہ تو تیار تھی۔۔۔ مکمل تیار!

آٹھ ماہ بارہ ماہ میں بدل گئے اور پھر چھ ماہ اور گزر گئے۔ وہ زندہ لاش بن گئی۔ اس کے سجدے طویل تر ہوتے گئے۔ انتظار نے اس کے اندر سے زندگی کی ساری رمق چوس لی لیکن وہ پھر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اسے گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اس نے صرف آٹھ ماہ کہا تھا اور اب ڈیڑھ سال بعد بھی وہ یہاں نہیں تھا۔۔۔ وہ کہاں تھا کسی کو معلوم نہیں تھا! بے رونق زندگی اپنا کرخت چہرہ لیے نظر آئی۔ زارا کو ہر صورت جینا ہی تھا۔ کشور چچی تقریباً" مکمل ٹھیک ہو گئی تھیں۔ وہ چلتی پھرتی صحن میں نظر آتیں۔ ان کے پاس کہنے کو لفظ تھے لیکن ڈانٹنے کو رعب باقی نہ رہا۔ زارا کو چپ کھا گئی۔ وہ خاموش پورے گھر میں چکر کاٹتی۔ گھر کے سارے کام کرتی لیکن منہ سے لفظ نکلتے اور سننے والی سماعت نہ پہچان پاتی۔ کیونکہ آواز سنے عرصہ گزر چکا تھا!

وہ جو سوٹ اس نے سلوا لیے تھے وہ فقیرنی کو دے دیے۔ جواب میں خوش رہنے کی دعا ملی۔ وہ اس دعا کو کیا کرتی؟ کس پلڑے میں رکھتی؟ اس کے پاس کوئی ترازو ہی نہیں تھا۔ آنکھیں بنجر ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے اتنے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے کہ شک پڑتا کسی قبر میں سے تعلق رہا ہے۔ ہاں یادوں کی قبر ہی تو تھی جو روز پکارتی تھی۔

کالی چوڑیاں وہ اتار دینا چاہتی تھی مگر کوئی لمس اسے جکڑ لیتا!

دروازے کے پاس کھڑی ہوتی تو یاد آتا۔ "میں اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھے دیکھ لو!" زین کے نقش نمکین نہیں تھے لیکن شہد آنکھوں کا مرہم روتا ہوا جسم ڈھونڈتا رہتا! اس کی آواز واقعی دل پہ دستک نہ دیتی بلکہ حکومت کرتی!

اس کی موجودگی آپ اتنی قوی تھی کہ کوئی اور خیال سامنے نہ آتا!

اس کی ساری مثالوں کے جواب ڈھونڈ لیے تھے لیکن وہ خود مجسم سوال بن کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔

وہ انتظار کی سولی پر ٹانگ گیا تھا۔ زندگی اس کے بغیر کیا تھی؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ایک غلط نقطے کے سوا کچھ بھی نہیں!

وہ ابھی سامنے آئے گا اور ہاتھ باندھ کے قریب آنا شروع ہو جائے گا۔ لیکن وہ خوابوں میں بھی گھومتا پھرتا نظر نہ آتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ سلطانہ آنٹی کے گھر جائے۔ اس کی کوئی خیر خبر لائے لیکن یہ کوئی کہانی تو تھی نہیں کہ وہ اسے گلے لگا لیتی، نہ ہی وہ محبت کے نام پر زندہ انسانوں کے درمیان معاشرتی ضوابط سے ہٹ کر کوئی کام کر سکتی تھی۔ وہ صرف اس کو سوچے جاتی۔ یاد کرتی رہتی۔ وہ لڑکی تھی بس یہی کر سکتی تھی۔

چھت پر جاتی اور باجرے کو مٹی کے ٹوٹے مرتبان میں ڈالتی۔

کہاں چلا گیا ہے وہ؟ کہیں روٹھ تو نہیں گیا؟ اگر روٹھ گیا ہے تو میں اسے کیسے مناؤں گی؟ میں کیا کروں گی؟ میں کس حد تک جاؤں گی؟ وہ خود سے سوال پوچھتی رہتی۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ملک کو اپنی پہچان کو دھتکار کر یہاں آیا تھا۔ ایجنٹ کے کہنے میں آکر اس نے صرف چالیس ہزار میں اپنے وطن سے جدائی خریدی تھی۔

ایک کشتی میں اس جیسے بیس اور مسافر بھی غیر قانونی طور پہ ریال کمانے کے خواب لیے بیٹھے تھے۔ جونہی کشتی پاکستانی ساحل کی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ ایجنٹ کا رویہ بدلتا گیا۔ ایجنٹ کی شکل پہلے ہی کرخت سی تھی۔ اب اس کرختگی میں کچھ کچھ نحوست سی در آئی۔ ایجنٹ نے اپنا نام پرویز بتایا تھا۔

پرویز کا رویہ ان کے ساتھ حاکموں جیسا ہونے لگا۔ وہ ان سب کو حقائق سے واقف کروانے لگا۔

"آج کل سرحد پہ سختی بہت ہے۔ میرے احکام مانو گے تو زندہ رہو گے۔ ورنہ عمان کی پولیس کے ہاتھ چڑھ گئے تو یہیں مر کھپ جاؤ گے۔" بیس کے بیس مسافر اسی جیسے تھے۔ نوجوان ' ڈرے ہوئے ' سہمے سہمے ' ورغلائے ہوئے چہرے لیے 'اپنی اپنی ماں کے زین.... زین کو یہ محاورہ ان کی بے چاری شکلوں پہ صادق آتا دکھائی دیا کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ ان لہروں کی طغیانی کہیں سے آئینہ چرا کر لاتی اور وہ زین کے سامنے رکھا جاتا تو وہ اپنی ہکابکا شکل دیکھ کر کبھی پہچان نہ پاتا کہ یہ وہی زین ہے جو کسی دوسرے سے ایک ہی گھونسے میں مٹی چٹوا سکتا تھا۔

یہ تقریباً" رات کا آدھا پہر بیت جانے کے بعد کے لمحے تھے۔ جب کشتی میں غیر معمولی سرسراہٹیں ہوئیں۔ ان سرسراہٹوں نے خوابیدہ اعصاب کے زین کو جھنجوڑ کر جگا دیا۔ زین دبے قدموں کشتی کے دوسرے کونے میں جانے کی کوشش کرنے لگا جہاں سرگوشیاں مسلسل سرسراہٹوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی آواز کا سرا پکڑتا۔ ایک بلند آواز نمایاں ہوئی۔

"اٹھو 'اٹھو سب اٹھو۔ میرے ایک ساتھی کی کشتی پکڑی گئی ہے۔ اس میں بھی تم جیسے دس گھامڑ سوار تھے۔ اب بتاؤ اگر سرحد پہ جا کر قربان ہونا ہے تو یہیں تمہیں مار دوں۔" بلند آواز پرویز کی تھی اور باقی کی دہشت اس کے ہاتھ میں پکڑی رائفل نے پھیلا دی۔ ان مسکینوں کی نیند کے نشے میں ڈوبی آنکھیں کھلی یہ خبر سن کر کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں۔

ڈر اور دہشت سے ان کی آنکھیں لرزنے لگیں اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اگر پرویز اکیلا ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا۔ اس جیسی کرخت شکل ' لمبے قد اور چوڑے شانوں والے پانچ ساتھی مزید کشتی پہ اپنی رائفلز کے ساتھ موجود تھے۔ جب ڈر اور دہشت نے اپنے پر اچھی طرح پھیلا دیے تو پرویز رائفل کی نالی نیچے کرتے ہوئے بولا۔

"میں بھی تم لوگوں کو مارنا نہیں چاہتا۔ افتاد ایسی آن پڑی ہے کہ کچھ مہینے تم لوگوں کو ہمارے اڈے پہ رہنا پڑے گا۔ ہمارا اڈہ تم لوگوں کے لیے محفوظ ہے۔ جونہی حالات بہتر ہوں گے تم لوگوں کو آزاد کر دیا جائے گا۔"

اس حکم کو جاری کرنے کے بعد انہیں ایک کشتی سے دوسری کشتی میں منتقل کیا گیا۔ منتقل کرنے کے بعد انہیں جو کھانا ملا وہ بندوق کے نشانے پہ کھلایا گیا۔ کھانے کے بعد انہیں کوئی ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو وہ صندوق نما بیرک میں تھے۔

عمان اور پاکستان کے درمیان تعلقات بہت اچھے ہیں۔ عموماً" جو لوگ غیر قانونی طور پہ سرحد پار کرتے ہیں۔ ان کو واپس بحفاظت بھیج دیا جاتا ہے اگر سرحد پہ ہی پکڑ لیا جائے۔ لیکن کچھ عادی مجرم بھی ہوتے ہیں اور کچھ پرویز کی طرح جرم کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تمام ریکارڈ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس دھندے میں رنگ بھرتے بھرتے اکثر ہی شکنجے میں آجاتے ہیں۔ ایسے عادی مجرموں کے لیے کوئی رعایت نہیں ہوتی۔ پرویز اگر گروہ کے ساتھ پکڑا جاتا تو گروہ کی زندگی خطرہ نہیں تھا لیکن پرویز کو بھاری بھرکم نقصان اٹھانا پڑتا۔ یہ بات گروہ میں شامل زین اور زین جیسوں کو نہیں معلوم تھی لیکن پرویز کو معلوم تھی۔ اس نے

اسی لیے کھیل کو اپنی مرضی سے کھیلا۔ سرحد پار کے ساتھیوں سے رابطہ کر کے ان جوانوں کو چھپانے کا سوچ لیا۔ جونہی حالات سازگار ہوتے انہیں عمان میں سر پٹخنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

وہ اپنے ملک سے کہہ کر آیا تھا کہ پاکستان میں کیا رکھا ہے۔ لیکن وہ اب پاکستان جانے کے لیے ترس رہا تھا۔ وہ ایک بار پاکستان جانے کے لیے ترس رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

تیری ہر اک نشانی جھوٹی
تیری یادوں کو مٹا دیتا ہے
چہچہائے نہ کوئی آنگن میں
سب پرندوں کو اڑا دیتا ہے
اب بسیرا نہ کریں وہ تازی
آخری پیڑ گرا دیتا ہے

وہ کشور چچی کے کہنے پر لاہور آئی تھی داتا دربار میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کے لیے کشور چچی آگے بڑھ گئی تھیں دعا مانگنے کے لیے وہ سسک رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

"کیا ہوا کہ اگر میں کچھ نہیں ہوں.... تو تو سب کچھ ہے میرے اللہ!

کیا ہوا کہ میرا کوئی اختیار نہیں.... تیرے اختیار میں تو سب کچھ ہے اللہ!

کیا ہوا کہ میں کچھ نہیں کر سکتی.... اس کائنات کا ہر ذرہ تیرے کن فیکون کا نتیجہ ہے اللہ!

کیا ہوا کہ اگر میں فانی ہوں.... تو تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا اللہ!

کیا ہوا کہ میں مانگنے کا سلیقہ سیکھتی ہوں اور پھر بھول جاتی ہوں.... تو مجھے ہر پل یاد رکھتا ہے اور بن مانگے نوازتا رہتا ہے اللہ!

اے اس دنیا اور آخرت کے مالک! میں تیری عظمت و بزرگی کو تسلیم کرتی ہوں۔ میں اپنے دل کی بے چینی ' بے کلی کو تیرے حوالے کرتی ہوں۔ نہ میرا اس سلسلے کی شروعات پہ اختیار تھا نہ میں اس بے سکونی سے نجات پانے میں قادر ہوں۔"

اپنا آپ وہ قادر مطلق کو سونپ کر ہچکیاں لے لے رو رہی تھی۔ اس کے آنسو تہجد کی وقت کی خاموشی میں رینگتے چلے جا رہے تھے۔ بادلوں کی اوٹ سے چاند نے خود کا ظاہر کیا۔ وہ چاندنی میں نہا گئی۔ قریب ہی لگا پیڑ من موجی ہوا کی اٹکھیلیوں سے لطف اندوز

ہوتے زمین چومنے لگا۔ ہلکورے لیتا وجود سجدے میں پڑے ہوئے نیند کی آغوش میں چلا گیا!

☼ ☼ ☼

صبح اس کی آنکھ کسی کے جگانے پر کھلی تھی۔

اس نے حیران نظروں سے سامنے دیکھا۔ وہ وہیں تھی اور اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ اس سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی تھی اور اس کا غرور خاکستر ہو کر اس کے عین سامنے راکھ کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھی کہ وہ بات کرنے کو ترس رہی ہے لیکن اس کا حلیہ کسی کو اس کے پاس پھٹکنے نہیں دے رہا تھا!

زارا پوچھنا چاہتی تھی کہ تم یہاں کیسے ... لیکن نہیں پوچھ سکی۔

زارا نے اسے کشور چچی سے ملوانا چاہا لیکن نشا نے ہاتھ جوڑ دیے وہ ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ اور پھر وہ ہاتھ جوڑے ہوئے ایک لمحے میں غائب ہو گئی۔ زارا اس کو ڈھونڈتی رہی لیکن وہ کہیں نہ ملی۔

اس نے کشور چچی کو بھی نہ بتایا کہ دینے کو کوئی ثبوت نہ تھا۔ اگلے دن وہیں اس کی گود میں کوئی کاغذ ڈال گیا۔ زارا نے بے حد وحشت سے دیکھا تو وہی نیلی چادر کا سایہ لہرایا جو نشا نے اوڑھی ہوئی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ اٹھ کر پیچھے جائے لیکن نہیں جا سکی۔

کشور چچی کی ایک بچپن کی سہیلی لاہور میں مل گئیں۔ زارا کا تعارف نشا کے طور پر ہی ہوا۔ انہیں یہی بتایا گیا کہ یہ نشا ہے بعد میں نام زارا رکھ دیا تھا کیونکہ نشا کی پیدائش سے وہ خاتون واقف تھیں۔ ناہید آنٹی نیک خاتون تھیں۔ فوراً گھل مل گئیں۔ اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔

"سعودی عرب میں ایک اسکول میں نان ٹیچنگ اسٹاف کی ضرورت ہے۔ اپنی بٹی کو لے جاؤ۔ یہاں رہنا ہے یا وہاں۔ تمہارے لیے ایک برابر ہے!" ناہید آنٹی نے تجویز دی۔

"اپنی ایسی قسمت کہاں کہ ہمیں وہ ملک دیکھنے کو ملے!" زارا آنٹی کی بات پر ہنس دی۔

"یہاں تو ایک انسان نہیں ملتا اور رب اپنے پاس بلائے کہاں ممکن ہے؟"

خیر طے یہ ہوا کہ زارا اکیلی انٹرویو وغیرہ دینے جائے گی۔ اگر تمام معاملات بخوبی حل ہو گئے تو پھر کشور چچی کو بھی اپنے پاس بلا لے گی۔ ابھی سب زاویوں سے اس بات کو جانچا جا ہی رہا تھا کہ سب کی آنکھ بچا کر زارا کمرے سے باہر نکل آئی۔

دوسرے کمرے میں جا کر دروازے کی اوٹ میں ہو کر نشا کا دیا کاغذ کھولا۔

"زارا!

کچھ بھی ہو جائے مگر بیٹی کو گھر سے بھاگ کر نہیں جانا چاہیے۔ شاید یہ ایک ہی لائن کافی ہے تمہیں میرا حال سمجھانے کے لیے۔ مجھے چاہیے تھا میں کاشف کو گھر بلاتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا۔ منع ہی کر دیتے ... وہ پھر آجاتا لیکن میں رخصت باپ کی دعاؤں میں ہی ہوتی۔ مجھے تیسرے روز ہی خبر مل گئی تھی کہ ابا دنیا چھوڑ گئے ہیں۔ اس کے بعد کاشف کا اور میرے اندر کا گلٹ سارے گھر میں پھیل گیا۔ وہ مجھے کہتے رہے کہ گھر جاؤ۔ آنٹی سے مل آؤ۔ اگر میں گھر آتی تو مجھے کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ اماں کے غصے سے واقف تھی۔ میں ضد کر کے شہر ہی چھوڑ آئی۔ جانتی ہو مہینہ ہی گزرا تھا کہ کاشف کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پھر انہوں نے لاہور آنے کی خواہش کی۔ وہ داتا دربار آنا چاہتے تھے۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر وہ یہ خواہش نہ کرتے تو میں اپنی ماں کو ایک دفعہ اور کیسے دیکھتی؟ میں آج لاہور میں اسی لیے ہوں کہ وہ مجھے لاہور ہی میں چھوڑ کر گئے۔ تمہیں زندگی میں رشتے نہیں ملے۔ یا یوں کہہ لو کہ کم ملے۔ تم نے ان سے سمجھوتا کر لیا۔ میرا دکھ یہ ہے کہ مجھے رشتے بہت ملے اور جب مجھے ان کی قدر آئی یا ان کی موجودگی کا احساس ہوا ... وہ مجھ سے بچھڑ گئے!

گھر سے نکلنے سے پہلے ابا کو دیکھنا آخری مرتبہ کا دیکھنا ثابت ہوا۔ جب کاشف کی ٹانگ ٹوٹی تو وہ سخت دلبرداشتہ ہو گئے۔ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ میں نے لاکھ کہا کہ میں آپ کی لاٹھی بنوں گی لیکن وہ دل چھوڑ بیٹھے۔ ایک عام سے دن معمولی سے دل کے درد کے بعد فوت ہو گئے۔ جانتی ہو کیا ہوا تھا انہیں؟ صرف ہارٹ اٹیک ... وہ شخص جو کہتا تھا میں نے اپنا دل تمہیں دے دیا وہ مجھ سے جھوٹ کہتا تھا۔ اس نے مجھے دل دیا ہوتا تو کیا دل کے اٹیک سے مرتا؟ اگر مجھے دل دیتا تو کیا میں اسے سنبھال کر نہ رکھتی؟ اگر دل میرے پاس ہوتا تو کیا اس شخص کو درد محسوس ہوتا؟ میری محبت کے دامن میں اس کے دل کو کچھ ہو سکتا تھا؟ وہ شخص جس کے لیے میں نے اپنی زندگی تیاگ دی' اپنا گھر چھوڑ دیا۔ وہ مجھے چھوڑ گیا۔ میں بھول گئی کہ وہ شخص بھی انسان ہے۔ خدا تو ہے نہیں کہ میں اس سے ہمیشہ ساتھ نبھانے کی توقع کرتی۔ یہ اللہ ہی ہے جو مجھے نواز رہا ہے کہ جب مجھے وہاں ہونا چاہیے جہاں تم ہو اور میں وہاں نہیں ہوں تو دو وقت کی روٹی مل جانا نوازا جانا ہی تو ہے۔ اللہ نے میرے سارے گناہوں کے بعد بھی' میری خطاؤں کے بعد بھی مجھے بھوکے پیٹ سونے نہیں دیا۔ تمہیں مزار کے اندر اماں کے ساتھ داخل ہوتے دیکھا۔ ایک دم دل چاہا دوڑ کر آؤں اور اماں کے گلے لگ جاؤں۔ انہیں بتاؤں کہ گھر سے بھاگنے والی ابھاگن ہی رہتی ہے' وہ کبھی سہاگن نہیں بنتی۔ وہ جیت گئی ہیں اور میں ہار گئی ہوں۔ پھر سوچا ان کے سینے میں ماں کا دل دھڑکتا ہے۔ مجھے سینے سے لگا بھی لیں گی لیکن دیکھو ابھی وہ مطمئن ہوں گی کہ میں انہیں اپنی خوشی کے لیے چھوڑ گئی۔ میں شاید خوش ہوں یہ خیال انہیں مطمئن رکھتا ہو گا۔ اور وہ جب مجھے یوں میلی چادر میں دیکھیں گی تو ہزار بد دعائیں بے شک دیں۔ ان کا دل میری تکلیف پہ تڑپے گا۔ وہ مجھے یوں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکیں گی۔ اور اب میں مزید تکلیفیں نہیں دے سکتی۔ میں نے جنت کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا ہے۔ میں نے جنت کے ہوتے ہوئے جنت گنوا دی۔ تم نے جنت کھو کر جنت کما لی۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے اماں کو میرا حال کبھی نہ بتانا۔ اللہ تمہاری نیکیاں قبول کرے۔

فقط قسمت کی ماری۔ نشا

چرمرائے کاغذ کے زارا نے ٹکڑے کیے اور اسے قریبی آیتوں کے شہید ہوئے صفحات والے باکس میں ڈال دیا۔ وہ اس راز کو آنٹی تک منتقل کرتی تو شاید برسوں بعد کمایا ہوا اعتبار کا لمحہ کھو بیٹھتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کشور آنٹی کے پاس تھی۔ اسے آج ایک کہانی کا انجام پتا چلا تھا۔ اس کا دل پورے زور سے دھڑکا کہ ہم عقیدہ آخرت کو لازمی رکن مان کر حساب سے نظریں کیوں ہٹا لیتے ہیں!

ضروری تو نہیں کہ سب اعمال کی پوچھ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پہ ہی ہو!

معجزہ

محبت معجزہ کوئی
محبت دل کے پنوں پر
لکھی اک نظم ہو جیسے
مدھر سی
سات سروں میں سمٹی راحت میں
کہی کوئی غزل جیسے
محبت کا سفر اک سحر سے آغاز ہوتا ہے
یقین کی منزلوں سے ہوتے ہوتے
دل اچکتا ہے
یہ کامل ہو تو جاں تو کیا
یہ جاں کی جاں بھی لیتا ہے
یقیں ایسا
جو جیون کی کٹھن ہر آزمائش میں پنپتا ہے
مگر پھر بھی
محبت کی کہانی کا کوئی انجام جو ہوتا ہے
تو وہ ہے معجزہ کوئی
محبت معجزہ کوئی

اس کی آنکھ پانی کے قطروں سے کھلی جو اس کے چہرے پہ مسلسل پڑ رہے تھے۔ اسے ہوش میں لے آنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کب کہاں اور کیوں اور کیسے اس کو صندوق سے نکال کر یہاں لا پھینکا گیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ کس کے سجدے میں بندھی ہچکیاں اور کس کی دعائیں اللہ سے رحم سمیٹنے میں کامیاب رہی تھیں۔ نجانے وہ کون سا اسم اعظم تھا جس نے عرش کے دروازے کھلوا دیے تھے!

یک بارگی کسی نے پوری پانی کی بوتل ہی الٹ دی۔

"تم کون ہو؟" اردو میں پوچھا گیا۔ اتنا اسے یاد تھا کہ وہ جہاں بھی ہے، بہرحال اپنے پاکستان میں نہیں ہے۔

"انسان ہوں!" رسی جل گئی تھی لیکن بل نہیں گیا۔

"نظر آ رہا ہے مجھے.... آئے کہاں سے ہو؟" اب پوچھنے والے کو غصہ آیا۔

"پتا نہیں کس جہنم میں تھا اور اب کون متھے لگ گیا ہے!" زین بڑبڑایا۔

"ہاہا۔ پاکستانی ہو؟ وہی زیادہ گدھے بنتے ہیں۔" سامنے والے کو ہنسی آئی۔

"پاکستانی اپنے اچھے دل کی وجہ سے بے وقوف جلدی بن جاتے ہیں۔" زین اس حالت میں کم از کم اپنی قومیت کے بارے میں کچھ نہیں سن سکتا تھا۔

اسے اپنا پاکستان ہی تو یاد آیا تھا اور بار بار یاد آیا تھا!

"میں بھی پاکستانی ہوں اٹھو۔" ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا گیا۔ مسیحا بن کر اس کی زندگی میں دستک دینے والا سکندر تھا!

عمر میں کوئی دس سال بڑا لیکن چھوٹے بچوں جیسا مہربان۔ جعلی طریقے سے ایجنٹ نے زین کو سرحد تو پار کروادی تھی لیکن اتنا عرصہ یوں رکھا کہ اس کی ایڑھیاں پھٹ گئیں اور جسم سکڑ گیا۔

اس کے ساتھ کے باقی سوار کہاں گئے؟ کیا ان کو بھی اسی طرح کسی صحرا میں چھوڑ دیا گیا ہوگا؟ یہ سب سوال اپنے پورے قد کے ساتھ موجود تھے لیکن وہ جواب نہیں جانتا تھا۔ اتنا ضرور معلوم تھا اسے کہ وہ زندہ رہا تو ہر ایسے ناسوروں کو منظر عام پہ لے کر آئے گا!

صحرا پار کرنا اس کے لیے سب سے مشقت والا کام

تھا۔ زندگی بھر وہ اس مشقت کو بھول نہیں سکتا تھا۔

سکندر کو اللہ نے چھپر پھاڑ کر نوازا تھا۔ نوازے جانے نے اس کے دل کو سخت نہیں کیا بلکہ مزید نرم کر دیا۔ وہ جتنا امیر تھا اس سے کہیں زیادہ سخی تھا۔ اس نے مزید چار ماہ لگائے۔ زین کی عمان میں رہائش کو قانونی کروایا۔ تب تک اسے اپنے پروں میں ڈھانپے رکھا۔

سکندر کے والد کا شمار پاکستانی رئیسوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے کاروبار کی شاخیں کئی ممالک میں پھیلا دیں تھی۔ ان کی زندگی میں ہی جب ٹیکسٹائل ملز کا نظام ٹھپ ہوتا نظر آیا۔ تو وہ اپنی متاع حیات اپنی اکلوتی اولاد سکندر کو لے کر ریاض میں رہائش پذیر ہو گئے۔

سکندر عمان اپنے کاروبار کے حوالے سے آیا تھا۔ اسے تنہا زندگی گزار گزار کے صحراؤں میں بہت کشش نظر آتی تھی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ تنہائی کو صحرائی کیا جائے۔ اسے گلف آف عمان صحرا دیکھنے کا شوق چرایا۔ رئیس زادے نے خصوصی جیپ لی اور نکل پڑا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ صحرا تنہا ہوتے ہوئے بھی کتنی وسعت رکھتے ہیں۔ ان کے دامن میں کتنے ہی طوفان اٹھتے ہیں لیکن گرد صحرا کی حدود سے باہر نکل کر نہیں جاتی!

وہ اپنے اندر بھی یہ ظرف پیدا کرنا چاہتا تھا کہ تنہائیاں جب بال کھول کر بین کرتی ہیں تو اس کے چہرے پہ کسی قسم کی وحشت اپنا نشان نہ چھوڑ سکے۔ کوئی نہ جان سکے کہ چھ فٹ لمبے اس مرد کا تکیہ رات کے آخری پہر اکیلے پن سے اوب کر نم ہونے لگتا ہے!

اس کی زندگی میں جو بھی قدم رکھتا صرف اپنی زندگی سنوارنے کی نیت سے رکھتا تھا۔ اسے لوگوں کے چہرے پڑھنے نہیں آتے تھے۔ وہ ان کو فائدے دے کر پھر تنہا ہو جاتا۔

اس صحرا کے دامن میں اس نے زندگی کے بقا کی جنگ لڑتے ہوئے زین کو دیکھا تو اس کا دل ہمدردی کے مارے پسیج گیا۔ اس کے تمام قانونی معاملات حل کروا کر وہ اسے اپنے ساتھ شہر ریاض میں لے گیا.....

سکندر کو زین سے انسیت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے خلوص کی وجہ سے سکندر کے دل میں گھر کرتا اس کا دست راست بن گیا۔ زین بھی سکندر کی نرم طبیعت کی برکتوں سے فیض یاب ہونے لگا۔ اس کے ساتھ معجزہ ہوا تھا کہ وہ زندہ بچ گیا تھا۔ سکندر کے پے در پے احسانات زین کے گلے میں یوں اٹکنے لگے کہ وہ اپنی ماں یا زارا کا نام بھی نہیں لے سکا۔ تاوقتیکہ اسے یہاں رہتے ہوئے دو ماہ مزید گزر گئے۔

زندگی ناقابل یقین حد تک ناقابل یقین ہے! یہ بات سو فیصد ٹھیک ہے۔ زین کو سمجھ آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے تین دن میں زارا کا پاسپورٹ بن گیا۔ ناہید آنٹی کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ انہوں نے انٹرویو کے لیے آنے جانے کا بندوبست کیا۔ زارا کشور چچی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی، اس لیے پہلے وہ اکیلی امید کی ڈور تھامے مکہ اور مدینہ جا رہی تھی۔ شاید وہیں کوئی دعا قبول ہو جائے! انسان کتنا بے یقین ہے، صبر ہی نہیں کرتا اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ کس کس دعا پہ رب تعالیٰ کن کن کہہ چکا ہے! دو دکانیں شبیر انکل کو بیچ دیں اور گھر کو تالا لگا دیا۔ کشور چچی نے اس کے پیچھے اس گھر میں نہیں رہنا تھا بلکہ لاہور ناہید آنٹی کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ زارا روکنا چاہتی تھی۔ اگر کالی چوڑیوں والا یہاں آیا تو تالا دیکھ کر خفا ہو جائے گا۔ وہ چاہتی تھی تالے پہ کوئی نشانی چھوڑ دے۔ اتنا آسان کہاں ہے نشانیاں چھوڑنا!

زارا ڈر رہی تھی، میرے پاس اس کی تلاش میں بھٹکنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور اب وہ اگر میری تلاش میں نکلا تو کہاں جائے گا؟ سالم چوڑیاں اور ٹوٹی ہوئی ہمت لیے وہ جہاز میں بیٹھ گئی۔

وہ باب الفہد سے حرم شریف میں داخل ہوئی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا فرش ارم لگ رہا تھا۔ اس نے نظر نہیں اٹھائی۔ اس نے سنا تھا کہ پہلی نظر میں جب کعبہ شریف کو دیکھو تو جو دعا مانگو قبول ہوتی ہے۔ اس نے

سوچا کہ وہ اس کے ملنے کی دعا مانگے گی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اللہ کے گھر کے پاس جاتی گئی اور پھر نظر اٹھائی۔

بس ایک نظر کی بات تھی۔ اس نے ایک نظر اٹھائی اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ وہ کیا مانگنے آئی تھی۔ وہ خود کون تھی۔ عہد الست اس کے اندر چیخ چیخ کر اللہ کو پکارنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ تو صدیوں سے یہیں پہ بس رہی ہے۔ اسے خود پہ افسوس ہوا۔ وہ ہر چیز ہر انسان بھول گئی۔ یاد رہی تو بس اپنی نافرمانیاں۔۔۔ اپنی خواہش اس وقت عذاب بن گئی۔

"اللہ میں کتنی بری ہوں ناں؟ میں اس شخص کی خواہش پلو میں باندھ کر آئی ہوں۔۔۔ میں تجھ سے قیامت کے دن تیرا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بھی مانگ سکتی تھی۔ میں تجھ سے مغفرت بھی مانگ سکتی تھی۔ بخشش بھی مانگ سکتی تھی۔ جس ماں نے جنم دیا اس کے درجات کی بلندی بھی مانگ سکتی تھی لیکن میں نے کیا مانگا۔ اللہ میں کتنی حقیر ہوں۔ میری خواہش کتنی حقیر ہے۔ میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ اگر تو نہیں چاہے گا تو میں خواہش بھی نہیں کر سکوں گی!"

اس کے آنسوؤں نے چہرہ بھگو دیا تھا۔ اسے سب قصے ساری کہانیاں بھول گئیں۔ نظر نے چاہا وہ کسی کی تلاش میں اٹھے۔ کسی کی موجودگی کا احساس ہوا کا جھونکا خوشبو کی صورت لایا تھا۔ لیکن شرمندہ دل اجازت نہ دے سکا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ روتی رہی۔ وہ مسلسل روتی رہی۔ اس نے ایک لفظ کی دعا نہیں مانگی۔ بس آنچل میں شرمندگی سمیٹتی رہی۔ اللہ سے راز و نیاز کرتی رہی۔ اس سے بخشش مانگتی رہی۔ رحمت مانگتی رہی۔

اس نے بے جان گھر سے جانا کہ وہ ذات کیا ہے۔۔۔ اس گھر کا جلال ایسا ہے اس کا اپنا جلال کیا ہو گا۔ اس جگہ پر نظر نہیں رک رہی تو اس کے سامنے پیش کیسے ہوا جائے گا۔ اس کا دل کسی ادھ ٹوٹے پتے کی طرح مسلسل لرزتا رہا۔ وہ اب ٹوٹی کے تب ٹوٹی کی عملی تفسیر بنی رہی۔ بہت دیر بعد اس نے نظریں اٹھائی تو [illegible] کی

خوشبو ہوا لائی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔

وہ وہیں تھا۔ اس کے پاس سے گزرا تھا۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ لیکن جب ہوا نے اس کی خوشبو کا پیرہن اوڑھ آئی ہے۔ اس نے بہت مشکل سے اس کا خیال جھٹکا۔

اللہ کے گھر کے سامنے کھڑا وہ اپنی ماں کی سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا۔ زارا سے ملنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی پھر سکندر نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دونوں حرم شریف سے باہر نکل گئے۔ اس نے آج پاکستان جانا تھا۔

وہ آج مکہ شریف آئی تھی اور وہ آج جا رہا تھا۔

وہ پاکستان واپس امید اور اندیشے لے کر آیا۔ اس کے امید بھی جیت گئی اور اس کے اندیشے بھی سچ ثابت ہوئے۔ اس کی ماں منتظر تھی۔ زندہ سلامت تھی۔ دیکھا تو گلے سے لگایا اور تب تک نہ چھوڑا جب تک ہچکی نہ بندھ گئی۔ وہ روتی جاتی اور اس کی بلائیں لیتی جاتی۔ زندگی کی دھوپ نے جہاں ماں کو کملایا۔ وہیں بڑھی ہوئی داڑھی نے اسے عمر سے بڑا بھی کر دیا۔ سلطانہ کے لیے یہ بیٹا نہیں چھاؤں تھا۔ وہ یکایک ٹھنڈک محسوس کرنے لگی۔

زین کی آنکھیں منتظر تھیں، اس کی سماعت منتظر تھی کہ کوئی تذکرہ تو دشمن جان کا بھی ہو۔ سلطانہ تو بس ایک ہی دفعہ گئی تھی۔ اس لڑکی کے پاس نہ کوئی تسلی دلاسا نہ تھا۔ ماں بھی اگر بار بار جاتی تو کہیں مورد الزام نہ ٹھہرا دیتی۔ منحوس کا لقب نہ دے دیتی۔ ماں اب بیٹے سے جھجک رہی تھی۔ زین کا انتظار سوال بن کر لبوں پہ اتر آیا۔ جب زارا کے متعلق پوچھا تو ماں کے پاس دینے کو صرف خاموشی تھی۔ زین زیادہ سوال نہیں کر سکا۔ فرمانبردار اولاد ایسی ہی ہوتی ہے!

ماں کی جدائی نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے وہ صحیح معنوں میں فرمانبردار بن گیا تھا۔

وہ اکیلا زارا کے گھر گیا۔ بڑا سا تالا منہ چڑا رہا تھا۔ کوئی نشانی نہیں تھی۔ نہ ہی سالم اور نہ ہی کوئی ٹوٹی

ہوئی چوڑی تھی۔ اس نے بشیر انکل سے جا کر پوچھا۔ انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ماں کو زارا کے آس پڑوس میں بھی بھیج کر دیکھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ روز جاتا اور تالا دیکھ کر واپس آ جاتا۔

ہفتے بعد اس نے واپس سعودی عرب جانا تھا۔ سکندر سے وعدہ کر کے آیا تھا۔ ماں کا پاسپورٹ بنوا چکا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں اس کی گلی میں رل رہا تھا۔ اسے یہ کہنے والا کہ تم مجھے ڈھونڈتی پھرو گی۔ اسے ڈھونڈ رہا تھا اور وہ تھی کہ مل ہی نہیں رہی تھی۔

اس کی آواز کا پیاسا ر اتجا بن بیٹھا تھا۔۔۔ رات کے اندھیرے جونہی سیاہی پکڑتی وہ اس کی دہلیز پہ جا کر بیٹھ جاتا! یہیں کھڑی ہوتی تھی وہ یہیں سے گزرتی تھی وہ ۔۔۔ وہ دہلیز کو ہاتھ سے چھو چھو کر مٹی پہ رشک کرتا۔۔۔

کیا پتا وہ اچانک سے آ جائے۔۔۔ ہوا اس کی خوشبو ہی چرا لائے۔۔۔ اس کی کوئی تصویر ہی ہوا کے ساتھ اڑتی باہر آ ئے۔ ان پیاسی آنکھوں کو دید کی کوئی سبیل تو ملے ۔۔۔! وہ صحرا میں رینگ کر اتنا نہیں تھکا تھا جتنا اس دہلیز پہ بیٹھ کر ٹوٹا تھا۔

جونہی سورج کی روشنی اندھیروں سے اپنے مقام کا شکوہ کرنا شروع کرتی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا۔

بدنامی اسے آج بھی مقصود نہیں تھی۔

زین کو صرف زارا چاہیے تھی!

وہ کیسے ملتی؟ وہ یہاں تھی ہی نہیں!

☼ ☼ ☼

وہ آج سعودیہ سے واپس آئی تھی۔ انٹرویو اچھا ہو گیا اور فلائٹ لاہور کی تھی۔ ناہید آنٹی کے گھر سے کشور چچی کو لیا اور اپنے گھر راولپنڈی آئی۔ کہیں گھر پہ لگا تالا اس کی خوشیوں کو مقفل نہ کر دے۔ بند گھر کھولا تو جالے لٹکے نظر آئے۔ موٹر تو کام کرنے سے ہی انکاری ہو گئی۔

"اتنے دنوں سے بند پڑی پڑی خراب ہو گئی ہے۔ گھر بیچنے سے پہلے اسے ٹھیک تو کروانا ہی ہو گا۔ میں افضل کو بلا کر لاتی ہوں تم تب تک صحن میں جھاڑو دے دو۔" کشور چچی تیزی سے بولتی زارا کو ہدایات دیتی باہر چلی گئی۔

وطن واپسی کا مقصد بوریا بستر سمیٹنا تھا۔ شاید خوشیاں واقعی مقفل ہونے والی تھیں۔

زارا کسلمندی سے اٹھی۔ اب اس کا شہر تو کیا یہ ملک بھی چھوٹنے والا تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کس کے سہارے یہاں رہنے پہ زور دیتی۔ وہ درخت کی اوٹ سے پرانی جھاڑو اٹھانے کو جھکی۔

اسی لمحے روز تالے کی شکل دیکھنے والا اندر آیا۔ کھلے دروازے نے اس کے تنفس کو تیز کر دیا۔

اس کے حواس بے قابو ہونے لگے۔ خوشی کے مارے وہ چیخنے کی خواہش کرنے لگا۔

اس نے زارا کو بازو سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ وہ گنگ تھی۔۔۔ معجزہ ہوا تھا! جس کی آمد تک دم توڑ چکی تھی وہ سامنے کھڑا سانس لے رہا تھا۔

جس کی خوشبو دھوکا دیتی رہی تھی وہ سامنے جدائی جھیلنے کے بعد کمزور ہوئی کھڑی تھی۔

صاف لگ رہا تھا محبت نے مات دی ہے۔ اس سادگی میں بھی اس کی کالی آنکھیں حسین قہر ڈھانے لگیں۔ اتنے مہینوں کا انتظار اس کے آنسوؤں میں جگہ بنانے لگا۔ اس کی اپنی حالت کہاں ٹھیک تھی۔ کچھ پھولا ہوا جسم اس کی جوانی کا باقاعدہ اعلان کر رہا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے ہجر کی داستان سنانے کو بے قرار نظر آئے۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"اب کیوں رو رہی ہو۔ اب تو آ گیا ہوں میں۔" وہ شوخ ہوا!

"اسی لیے رو رہی ہوں۔" اس نے ناک پر مکھی کہاں بیٹھنے دینی تھی۔

"بہت انتظار کیا میرا؟" وہ سوال پوچھ رہا تھا۔

"تم اتنے خوش فہم کیوں ہو؟" اس نے بھی جواباً سوال ہی پوچھا۔

"تو تم نے انتظار نہیں کیا؟" وہ مسلسل سوال پر اٹکا رہا۔

”تم نے دیکھا مجھے گلیوں میں؟میں تمہارے انتظار میں بالکل نہیں بھٹکی!“ لہجے میں انتظار کی مسافتیں بلبلا اٹھی۔

”پھر یہ چوڑیاں کیوں نہیں اتاریں؟“ زین نے زارا کی کلائی پکڑ کے زارا کے سامنے رکھی۔

”چھوٹی ہو گئی تھیں ورنہ اتار دیتی!“ وہ نظریں چرا کر ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی۔

”اسٹیل کی تو تھیں نہیں۔ کانچ کی تھیں۔ توڑ دیتیں یا میرے کہے پہ اندھا یقین تھا؟“ وہ اس کے چہرے کی قوس و قزح کا لطف لینے لگا۔ کلائی ابھی بھی تھامی ہوئی تھی۔

”میرا سر مت کھاؤ!“ اسے پتا نہیں کیوں غصہ آنے لگا۔

”لفظ تو ٹھیک بولا کرو۔ اچھا تمہیں پتا ہے میں نے کعبہ شریف کے سامنے تمہیں مانگا!“ وہ بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔

”کیا مطلب؟ تم بھی وہاں تھے؟“ زارا کی آنکھیں کھل گئی۔

”تم بھی سے کیا مراد ہے تمہاری؟ کیا تم بھی وہاں گئی تھیں؟“ وہ بھی حیران ہوا۔

اس نے خود کو دل ہی دل میں کوسا۔ گویا دل کو یونہی سکون نہیں آیا تھا حرم شریف میں ... میں بھی کتنا خبیث ہوں۔ اس ایک لڑکی کو سوچ کر باقی ساری باتیں بھول جاتا ہوں۔ اللہ نے میرے دل میں اتنی محبت ڈال ہی کیوں دی۔

”ہاں لیکن اچھا ہوا۔ تم مجھے وہاں نہیں ملے ورنہ میں تمہارا چہرہ تک نہ دیکھتی!“ زارا کو سابقہ شرمندگی پھر یاد آئی اور کچھ ماندہ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

”اگر اللہ چاہتا تو مجھے وہاں بھی تمہارے سامنے لاتا۔ تم وہاں بھی میرا چہرہ دیکھتیں۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں۔ دیکھنا نہ دیکھنا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ ملنا نہ ملنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو اللہ ہے جو ملواتا ہے۔ معجزے دکھاتا ہے۔“ زین اسے سمجھا رہا تھا اور وہ اس کی کلائی چھوڑ چکا تھا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ زارا کچھ سننا چاہتی تھی۔

”تمہیں چاہتا ہوں۔ شادی کرو گی؟“ زارا کو زین کے دھیمے لہجے میں کیے گئے سوال سے خوشی ملی۔

”کہاں لے کر جاؤ گے؟“ زارا سوال کے بدلے سوال لیے کھڑی ملی۔ زین کو حیرت ہوئی ‘ اسے جواب نہیں ملا تھا۔

”سعودیہ ... اماں کا ویزا آگیا ہے۔ تم بھی چلو ساتھ!“ زین اپنے سوال سے آگے کی بات کہہ بیٹھا۔

”کشور چچی کو بھی لے جاؤ گے؟“ زارا نے پوچھا۔

”بشیر چچا کو بھی لے جاؤں گا!“ وہ ہنس کر بولا۔

”تم میری بات پر ہنسو گے اب؟“ وہ پھر سوال کر رہی تھی۔

”ہاں جب تک تم مجھے جواب نہیں دو گی!“ وہ اس ایک جواب کے لیے ترسا ہوا تھا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے!“ اس نے منہ موڑا۔

”دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ میرا انتظار نہیں کیا تھا؟ اس لیے کیا تھا کہ مجھ سے منہ موڑ کر کھڑی ہو؟ میرے سوال کا جواب نہ دو؟ مجھے ٹال دو۔“ وہ پریشان ہو گیا۔

”میں تمہیں نہیں ٹھکرا رہی۔ سمجھو میں خود کو ٹھکرا رہی ہوں!“ زارا نے سامنا نہ کیا۔ کوئی سودا سر میں سمایا۔

”تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ مان کیوں نہیں لیتیں۔ ہاں کر دو۔ مزید مت تڑپاؤ۔ خود کو بھی اور مجھے بھی۔ تم واقعی نہیں رہ سکتیں۔“ وہ فریاد پہ آگیا زارا نے اپنی کلائی زور سے درخت پہ ماری چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

”میں رہ سکتی ہوں۔“ زارا نے اسے حیران کیا۔

”کیسے مانو گی؟“ زین اپنے گھٹنوں پہ بیٹھ گیا۔

”ایک کام کرو میرا!“ زارا نے فرمائش کی۔ زین نے سر جھکا کر بات سنی۔

”یہ لڑکا پھر آگیا! پیچھے سے آنے والی کشور چچی تھیں۔ زین ان کے سامنے اپنا ہاتھ ماتھے تک لے کر

گیا۔ ہلکا سا مسکرایا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ گھٹنے جھاڑے ‘ ہاتھوں پہ لگی گرد کو زارا کے سامنے پھونکا اور باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کس منہ سے سامنا کرے گی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا استقبال کیسا ہو گا۔ ہزاروں وسوسے لیے اس گھر کی دہلیز پہ قدم رکھے ‘ اس کا لٹا پٹا سا حلیہ حال سنا رہا تھا۔

کشور چچی آگے بڑھی اور اس چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر چومنے لگی۔ وہ چہرہ جس کے بارے میں وہ بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے اس کی غیر موجودگی میں ایک دفعہ بھی اس کا نام نہیں لیا تھا اور اس چہرے والی کو بھی سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا منہ لے کر گھر جائے۔ آج بھی اس گھر میں اس کا چہرہ چوما جا رہا تھا۔ نشا اور کشور چچی کا ملنا... زارا کی آنکھیں بھگو رہا تھا۔

”تو نے کیا حال بنا لیا ہے اپنا؟ کوئی تکلیف تھی تو واپس کیوں نہیں لوٹ آئی!“ کشور چچی نے خود سے الگ کر کے پوچھا۔

”سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ واپس کیسے آؤں؟“ نشا نے جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔

”جانے والے کو روکنے کا طریقہ نہیں ہوتا لیکن آنے والے کے لیے اگلے پچھلے سب دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ بے شک منہ اندھیرے آتی بے شک صبح سویرے آتی۔ یہ دروازہ تجھ پہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ تیرے باپ نے اپنی آخری سانسوں میں تیرے لیے معافی ہی مانگی تھی۔“ ماں بول رہی تھی۔

اولاد کتنی ظالم شے ہے۔ صحیح ہی تو کہا ہے اولاد فتنہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا۔ سو برائیاں بھی کر کے واپس آئے تو ماں باپ گلے سے لگا لیتے ہیں۔ غلطیاں بھول جاتے ہیں۔ اولاد کی خراشیں یاد رہتی ہیں اپنے زخم یاد نہیں آتے۔

زین پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ کشور چچی نے زین کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اس سے زیادہ اچھا شکریہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ زارا نے نظر اٹھا کر زین کو دیکھا۔ آنکھیں شکریہ کہہ رہی تھیں وہ زارا کا کام کر چکا تھا۔

زین نے سکندر سے فون پر بات کی اور پھر بشیر انکل کو چھوڑ کر باقی سب کو حق سے لے کر واپس ریاض آ گیا۔

☆ ☆ ☆

سب سے زیادہ خوشی زارا کو تھی وہ زین کی منکوحہ کی حیثیت سے ریاض آئی تھی۔ کشور چچی نے اپنے اور نشا کے ساتھ جانے کی مخالفت کی لیکن زارا جیسی بیٹی کی ضد کے آگے وہ بھی نہ ٹھہر سکیں۔ ساتھ چلی آئیں۔ نکاح کے ساتھ ہی رخصتی کے حق میں زین نہیں تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کا محسن ولیمے میں شرکت کرے۔ کشور چچی نے بھی سوچا زارا کی رخصتی کے بعد واپس لوٹ آئیں گی۔

ریاض میں آئے دوسرا روز تھا۔ زین نے سب سے نظر بچا کر زارا کو اکیلے میں جا لیا۔ اس من موہنی سے لڑکی کے نمکین نقوش اور تیکھے پن پہ اب اس کا حق تھا۔ وہ بہت خاموشی سے دیکھتا رہا کہ اس کے ہاتھ تھام لینے پہ زارا کا تیکھا پن تابعداری میں بدلا ہے۔ وہ اس میں اتنی سی تبدیلی بھی برداشت نہیں کر سکا۔ اس کے کالے بالوں کی ایک لٹ کو کان کے پیچھے سے نکالا اور لبوں پہ اٹکھیلیاں کرنے کو آزاد چھوڑ دیا۔ بال اس کے سائے میں رنگ منعکس کرنے لگے۔ وہ محظوظ ہوا۔ تھوڑا قریب آکر مکمل شوخی سے اس کی ناک دبا کر گویا ہوا۔

”مجھ سے پوچھو گی نہیں کہ کیسے ڈھونڈا تمہیں؟“

”میں کیوں پوچھوں؟ تمہیں خود شوق ہے تو بتا دو۔“ زین کی شرارتوں نے اس کی تیکھے پن میں رنگ ڈالے۔ زین نے جواباً ”اپنی آنکھوں سے محبت نثار کر کے اس کی بلائیں لینے کی کوشش کی۔ زارا نے بوکھلا کر اسے پرے دھکیلا اور پوچھا۔

”تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا۔“ زین ہاتھ سینے پہ لپیٹے

یقین تک کا سفر سناتا رہا۔
"اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔" زین کی اس بات کو زارا نے پورے دل سے تسلیم کیا۔ واقعی اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے تب ہی اللہ نے زارا کو زین سے نوازا۔

☆ ☆ ☆

سکندر نے نشا کو دیکھا تو اسے اس بات پہ یقین آگیا کہ دو ادھورے لوگ ایک دوسرے کو مکمل کر سکتے ہیں۔ نشا کا سوگوار سا حسن اپنے اردگرد پھیلی مادی اشیاء کو قابل داد گردانتا نظر نہ آیا۔ پہلے اسے کاشف کا ساتھ درکار تھا۔ اس ایک ساتھ کے لیے وہ چار دیوار چھوڑ کر نکلی تھی۔ اب کاشف کے بعد اسے دنیا اپنی طرف کھینچنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ نشاء کی آنکھوں میں سہمی ہوئی ہرن چھپتی پھرتی۔ سکندر نے اس ہرن کو نقصان پہنچائے بغیر کستوری حاصل کرنے کا خواب دیکھا۔ اس خواب سے وہ گڑبڑا کر اٹھا۔ اسے آج تک لوگوں سے شکایت رہی تھی کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پاس آتے ہیں۔ اس نے اپنے ضمیر کو ٹٹولا۔ کیا وہ بھی کسی کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا... ضمیر اس فیصلے پہ مطمئن نکلا۔

مکمل اطمینان کرنے کے بعد اس نے سوچا اس خواب کا بوجھ کسی اور کے کندھے پہ ڈالا جائے۔ نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ زارا نے سنا تو بہت خوش ہوئی۔ سلطانہ آنٹی سے یہ خبر لے کر وہ سیدھا زین کے کمرے کی طرف بڑھی۔ سکندر نے زین پہ سلطانہ آنٹی کو ترجیح دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی خواہش کو احسان سمجھا جائے یا احسان کا بدلہ گردانا جائے۔

زارا زین کے کمرے میں اس کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ رخصتی سے پہلے یہ اس کی انجانے میں کی جانے والی جسارت تھی۔ دروازہ کھول کر جیسے ہی داخل ہوئی۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتی۔ زین کا دھیان اس کی خالی کلائی پہ گیا۔ اسے کا پارہ اچانک چڑھا۔ وہ تھوڑا غصے سے بولا۔

"تم نے چوڑیاں کیوں توڑیں؟"

"کیوں کہ وہ کالے رنگ کی تھیں۔" زارا نے جواب دیا اور اس ایک جواب میں سارے جواب پنہاں تھے۔ زین نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پشت سے دروازہ دھکیلا وہ بند ہو گیا۔ سوال باقی نہیں رہا تھا لیکن تنگ کرنے کا حق زین کو بھی تھا۔

"کالی تھیں تو کیا ہوا... دی تو میں نے تھیں نا؟"

"اب یوں کرو گے؟ اور چوڑیاں لے کر دیتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے؟" وہ ایسے بے تکلف ہوئی جیسے سدا ساتھ رہی ہو۔

"کہو تو چوڑیوں کی دکان کھول کر بیٹھ جاؤں؟" اس نے چڑایا۔

"چوڑیوں کی دکان سے کمائی اچھی نہیں ہوتی!" اس نے بھی چڑایا اور زین کو ہنسی آگئی۔

"زین۔" زین کو لگا اس نے پہلی دفعہ اپنا نام سنا ہے۔ کوئی مدھر سا نغمہ دھڑکنوں نے چھیڑا۔

"جی زین کی جان!" وہ چڑا نہیں رہا تھا۔ ستا بھی نہیں رہا تھا محبت کر رہا تھا اور اسے یوں ہی محبت کرنا آتی تھی۔

"میں نے یقین تو کیا نہیں پھر معجزہ کیسے ہوا؟" وہ یوں سوال کر رہی تھی جیسے ہر سیڑھی پر ساتھ رہا ہو۔ وہ زارا کے لیے ہم جان تھا۔

"تم نے محبت تو کی تھی نا۔ محبت خود یقین ہے۔ وہ خود معجزے کے سامنے کھڑی ملتی ہے!" زین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا یا جذب کر رہا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو محبت معجزے کے ساتھ کھڑی ملتی ہے۔ موسیٰ کو اللہ کی چاہ تھی تو انہیں معجزہ ملا۔ یہ معجزہ ہی تو تھا کہ موسیٰ نے عصا ڈالا۔ وہ فرعون کے دربار والوں کو اژدھا نظر آیا اور جادوگروں کے سارے سانپ نگل گیا۔ یہ معجزہ ہی تو تھا کہ ایک رات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے ملاقات کی۔ وہ براق پہ گئے۔ جس کی رفتار بہت تیز تھی۔ لفظ برق بھی تو بجلی کے معنوں میں آتا ہے یعنی بجلی کی سی تیزی سے۔ دیکھو آج اس بات کو سائنس بھی ثابت کرتی ہے۔ یعنی معجزہ وہ ہے جس کو عقل بھی تسلیم کرے جیسے تمہارا ملنا بھی معجزہ ہے۔ محبت خود معجزہ ہے۔" وہ کسی اثر میں آئی ہوئی لگی سوہنا ٹھہرے کہتی رہی۔

"میں تمہاری آدھی بات سے متفق نہیں ہوں۔ زارا معجزہ کوئی کہانی کوئی قصہ کوئی حکایت کوئی داستان نہیں ہے۔ معجزہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ معجزہ حقیقت سے ماورا ہے۔ حضرت موسیٰ کا عصا ڈالنا معجزہ ہے۔ لیکن ان کے لیے عقلی توجیہہ پیش کرنا غلط ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔ میں ان خاص باتوں کو عام باتوں کے معیار پر لا ہی نہیں سکتا۔ تمہارا اور میرا ملنا تمہارے اور میرے لیے خاص ہے ورنہ عمومی طور پر دیکھا جائے تو یہ بہت عام بات ہے زارا۔ اس کی عقلی توجیہہ پیش کرنا ٹھیک ہے۔ یہ ہم نکموں کے لیے معجزہ ہے۔ چھوٹا سا معجزہ جو حرف کن کا محتاج ہے لیکن حضرت موسیٰ کا عصا کیسے اژدھے میں بدلا' براق کیسے اتنی رفتار سے چلا۔ اس بارے میں بات کرنا ہمارا کام نہیں۔

ہمارا کام اللہ اور اس کے احکامات اور اس کی کتاب پہ آنکھیں بند کر کے یقین کرنا ہے ہم کیوں دلائل ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں؟ یہ تو اللہ کا احسان ہے۔ ہم پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہمیں بلائنڈلی ٹرسٹ کرنا چاہیے۔" وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی شرارت نہیں تھی۔ وہ صاف سیدھے لفظوں میں بات کر رہا تھا۔ یہ اس کا بھروسا تھا جو اسے بیرک سے پھر صحرا سے زندہ نکال لایا۔ وہ اس بارے میں مذاق یا شرارت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"لیکن زین ہمیں دلائل تو ڈھونڈنے چاہیے۔ غیر مسلموں کو مطمئن کرنے کے لیے ہمیں تعلیمات کو پرکھنا چاہیے۔ پھیلانا چاہیے۔ ایک دوسرے کو بتانا چاہیے" زارا اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی دلائل کوئی توجیہہ نہیں چاہیے ہوتی۔ اس کے لیے ایک لمحہ چاہیے۔ وہ لمحہ جسے اللہ قبول کرلے۔ جو لوگ "اف" اور "بٹ" میں پڑتے ہیں 'وہ بھروسا کر لیتے ہیں یقین نہیں کر سکتے۔ یقین جانو... یقین بھروسے سے کہیں آگے کی چیز ہے!" وہ اسے اپنی سوچ سے ملوا رہا تھا۔ وہ سوچ جو اس کی شکل و صورت سے بھی کہیں زیادہ پیاری تھی۔

"یقین بھروسے سے کہیں آگے کی چیز ہے اور تم چاہتے ہو میں تمہارا یقین کرلوں۔" زارا نے اسے واپس اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اگلی سیڑھی سامنے نہ آئے اور ساتھ کوئی آزمائش نہ لائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے زین کی سوچ سمجھ آجائے اور وہ اس سے مزید محبت کرے۔ وہ اس سے زیادہ محبت نہیں کر سکتی تھی۔

"ہاں یقین ہی تو مانگا ہے تمہارا۔ یقین کرو گی مجھ پر؟" زین اس کے قریب آیا۔

"ہاں تاکہ تم مجھے پھر چھوڑ کر چلے جاؤ!" زارا نے جوابا" روٹھے لہجے میں کہا۔ زین کا قہقہہ ابل پڑا۔

"اب گیا تو جان سے مار دینا۔ اب جہاں جاؤں گا تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا!" زین اس کے عین سامنے کھڑا ہوا۔

"حق مہر میں کیا دو گے؟" زارا نے عجیب سوال پوچھا۔

"میں حق مہر ادا کر چکا ہوں۔ اماں نے دیا نہیں تمہیں؟" زین حقیقتاً پریشان ہوا۔

"وہ حق مہر تو کاغذ کے صفحوں پر لکھا تھا۔ اب یقین کے پروں پہ بھی کچھ لکھ دو!" زارا نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور اس کی پریشانی سے فائدہ اٹھاتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ زین دروازے کے پیچھے لپکا تو اس کی مدھر سی ہنسی سنائی دی۔ وہ وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

معجزہ واقعی بڑا تھا... اسے احساس ہوا!

اب زارا نے پھر کچھ مانگا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج سکندر اور نشا کا ولیمہ اور زارا کی رخصتی بھی تھی۔ ولیمے کے بعد سب نے زین اور زارا کو اللہ حافظ کہا۔

آج واقعی اس کا حق مہر ادا ہونے ہی والا تھا۔ وہی جو اس نے یقین کے پروں پہ لکھنے کو کہا تھا۔ وہی جو اس کے رشتے کو اور بھی مضبوط کر دیتا۔ ایک ساتھ کیا جانے والا حج.....!

وہ کعبہ شریف کے قریب تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک سوڈانی جوڑا زارا کے قریب سے گزرا۔ ساتھ ہی کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ زارا کا بریسلٹ اس لڑکی کے ریشمی گاؤن کی ایک تار سے الجھا۔ زارا نے بازو چھڑوانی چاہی۔ زین کو ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔ زین نے آنکھ کے اشارے سے کہا' جانے دو یہاں بچھڑنے والے کھو جاتے ہیں۔ زارا کی آنکھوں میں تذبذب لپکا۔ وہ اس بریسلٹ کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ یہ زین نے اسے تحفہ میں دیا تھا۔ اس پر نگوں سے "zain's zara" لکھا ہوا تھا' زین نے اس کا ہاتھ تھاما۔ زارا نے زین کے ہاتھ کو سختی سے دبایا۔ محسوسات سے تسلی کی لہریں بھیجیں اور ہاتھ چھڑوالیا۔ وہ بریسلٹ لینے جا رہی تھی۔ زین اسے روکنا چاہ رہا تھا' لیکن روک نہیں سکا۔ صرف چند ساعتوں کی بات تھی وہ جو جان جہاں تھی۔ جان بن گئی تھی۔ دھڑکنوں کے قریب تھی۔ نظروں سے ذرا سی اوجھل ہوئی اور ساتھ ہی کرین گر گئی۔ ایک لمحے میں منظر بدلا تھا۔ خوشیاں رینگنے لگی تھیں اور آزمائش منہ کھولے ہنس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

زین کا فون اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ بھگدڑ میں وہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں موجود تھا۔ پہلا لفظ اب جو اس نے بولا زارا بولا۔ اس نے زارا کے بارے میں پوچھا' لیکن کسی کو اس کی زارا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اسے نیند کا انجکشن دے کر پھر سلا دیا گیا۔ وہ نیند میں بھی بے چین تھا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ اس کا ہاتھ اس سے زیادہ مضبوطی سے تھام لیتا تو کیا وہ چھڑا پاتی' لیکن نہیں اس میں ہاتھ تھامنے کا ہنر ہی نہیں تھا۔ وہ ناکام ہوا تھا۔ بہت بری طرح ناکام ہوا تھا۔ وارڈ چھان ڈالے۔ وہ کہیں نہیں تھی' پھر اسے پتا چلا کہ یہ واحد اسپتال نہیں ہے۔ جہاں زخمیوں کو لایا گیا ہے۔ پھر اس نے ہر اسپتال میں دیکھا زارا اسے کہیں نہیں ملی۔

کسی نے اسے کہا کہ مردہ خانے جا کر دیکھو۔ وہ اسپتال میں یوں داخل ہوا جیسے خود کوئی اور زندوں میں زندگی ڈھونڈنے آیا ہو۔ ہر لاش کو دیکھتے اس کے چہرے پر ایسی تکلیف آجاتی کہ اس کے پاس کھڑے لوگوں کو لگتا کہ اس کی تلاش کو منطقی انجام مل گیا ہے' لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

اس نے وہیں وہ لاش دیکھی جس نے ریشمی تاروں سے سجا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ اس کی بازو کے ساتھ بریسلٹ اٹکا ہوا تھا۔ زارا بریسلٹ نہیں چھڑا سکی اور زین زارا کو نہیں بچا سکا۔ اس نے خاموشی سے بریسلٹ اٹھایا اور مٹھی میں دبا کر زور سے چلانے لگا۔ اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے خود بھی سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ چلاتے ہوئے کیا کہہ رہا ہے۔ اسپتال والوں نے اسے زبردستی باہر نکالا۔

وہیں سڑک پر پڑے پڑے زین کو خیال آیا۔ کہیں دوسرے اسپتال میں کوئی وارڈ رہ گیا ہو۔ لمحے کا اعجاز تھا' ورنہ وہ تو اپنی طرف سے سارا اسپتال چھان آیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ ہمیں پریشانی میں منہ کے سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ کہیں میرے ساتھ بھی ایسا نہ ہوا ہو۔ وہ اٹھا اور سرپٹ دوڑا۔ اس کے ہاتھوں میں پسینہ آرہا تھا اور بریسلٹ ہاتھ سے پھسلتا جا رہا تھا' لیکن وہ دوڑتا جا رہا تھا۔ ایک گاڑی اس کے سامنے آ کر رکی اور اسے زبردستی لفٹ دی۔ وہ اپنے دل کی سن رہا تھا۔ دل نے کہا سیڑھیاں چڑھ جاؤ۔ اب وہ یہیں ہوگی۔ وہ یہیں ہوگی۔ اس نے دل کی سنی۔ وہ گیا۔

اس نے حسبنا اللہ و نعم الوکیل پڑھا اور دروازے کی ناب ہلا کر اندر داخل ہو گیا۔ نچڑی ہوئی اور کمزور سی خاموشی... بالکل خاموش وہ وہی تھی۔ وہ زارا تھی۔ اس کے ساتھ اتنی مشینیں لگی ہوئی تھیں' جیسے اسے قید کر دیا گیا ہو۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا۔ سر اس کے کینولا لگے ہاتھوں میں گرا کر بولا۔

"شکر الحمدللہ۔" وہ یہی کہہ سکتا تھا وہ شکر ہی ادا کر سکتا تھا۔ اور وہ شکر ادا کر رہا تھا۔

زین' زارا کا ہاتھ تھامے وہیں ہوش کھو بیٹھا۔ ہاتھوں' پاؤں اور آنکھوں میں مسافتوں کی تھکن تھی۔ زارا کے لمس سے آشنائی پاتے ہی سکون نیند کی چادر اوڑھ کر زین کے سینے سے لپٹ گئی۔ کمرے میں آہٹ ہوئی۔ ڈاکٹرز کا ایک وفد اندر آیا۔ زین جھینپ کر اپنا تعارف کروانے لگا۔ ڈاکٹرز نے خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ وہ آپس میں بحث میں مصروف تھے۔ زین ان کو سن ہوتے دماغ سے سننے لگا۔

"میرے خیال میں مریضہ کو Post traumatic stress disorder ہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے کیسز سامنے آچکے ہیں۔ بوڑھے ڈاکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈالے اطمینان سے کہا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر' لیکن اس کیس میں ایک چیز مختلف ہے۔ باقی جتنے پیشنٹس ہیں۔ وہ خاموش ہیں یا پھر کوئی رسپانس کرتے ہیں' لیکن یہ پیشنٹ جیسے ہی ہوش میں آتی ہیں۔ چیخنے چلانے لگ جاتی ہیں۔" جوان ڈاکٹر تھوڑا پریشان نظر آیا۔

"جب ایسے حادثات کو Witness کیا جاتا ہے تو دماغ کافی حد تک متاثر ہو جاتا ہے۔ انسان کا چیخنا اور چلانا نارمل ہے۔ آپ ان کو ریلیکس رکھنے کے لیے نیند کے انجکشن لگاتے رہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ خود چلا چلا کر چپ ہو جائیں گی۔ جتنا ممکن ہو سکتا ہے' ان کو پرسکون رکھنے کی کوشش کریں۔" سینئر ڈاکٹر اپنا تجربہ نچوڑنے لگا۔

زین کو بے ہوش زارا پہ پیار آیا۔ وہ جتنا آزمائش سے ڈرتی تھی' اتنی ہی آزمائش کے شکنجے میں آتی تھی۔

اگلے دن سکندر کو زین کی کال آئی کہ زارا ٹھیک نہیں ہے۔ زین نے سکندر کو واپس جا کر کشور چچی اور سلطانہ آنٹی کا خیال رکھنے کو کہا۔ اس نے کہا تھا' اس زمین پر میں بہت ہوں جو اس کا خیال رکھ سکتا ہوں۔ مجھے صرف اوپر والے کی رحمت کا انتظار ہے۔ سکندر مادی وسائل کی فراہمی یقینی بنا کر واپس چلا گیا۔ زین پھر سے یقین کے پر تھامے اور معجزے کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اس نے کھڑکی کے پٹ وا کیے۔ سورج کی روشنی اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ اندر داخل ہوئی جیسے وہ فاتح ہو اور کمرے کے اندر موجود نفوس مفتوح ہو۔ زین نے اس کے ہونے کو تسلیم کیا اور اپنی بازو آنکھوں پر رکھ دی' لیکن زارا کے وجود میں ذرا برابر بھی جنبش نہ ہوئی۔ وہ بستر پر لیٹی تھی اور اس کے اطراف میں ویسی ہی مشینیں تھیں جیسے اسپتال میں موجود تھیں۔ روز یونہی ہوتا رہا۔ زین پہ روشنی اثر کرتی رہی۔ زارا روشنی سے بے خبر لیٹی رہی۔ تقریباً" سال گزر چکا تھا۔ زین روز آتا۔ اس سے بہت سی باتیں کرتا۔ صفحے کالے کرتا رہتا' لیکن وہ تھی کہ خاموش بالکل خاموش رہتی۔ آنکھیں کھول کر زارا سامنے دیوار کو دیکھ لیتی اور آنکھوں میں اتنی اجنبیت ہوتی کہ زین خوف کھانے لگتا۔

"ایسی بھی کیا ناراضی زارا۔ کچھ تو بولو؟" وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو دیتا۔ اس کی ساری ہمت آنسوؤں کے راستے بہہ نکلتی۔ زارا کو کوئی فرق ہی نہ پڑتا۔ وہ ساکن تھی بالکل ساکن... اگلے دن پھر ہمت پکڑ کر کمرے میں آتا۔ زارا کو بتاتا۔ "تمہیں پتا ہے میں نے تمہارے لیے ہر رنگ کی چوڑیاں لی ہیں' سوائے کالے رنگ کے۔" وہ پھر بھی نہ بولتی۔

ڈاکٹر اس سے ناامید ہو چکے تھے۔ اس کی بیماری کی دو اقسام تھیں اور زارا disorder

delayed post traumatic کی میعاد سے بھی زیادہ عرصہ گزار چکی تھی۔ اس میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی۔ بالکل خاموش۔۔۔ اسپتال والے زارا کو رکھنے سے انکاری ہوگئے تھے۔ کیونکہ زین نے انہیں الیکٹرک شاک لگانے سے منع کردیا تھا۔ زین اسے اپنی ذمہ داری پہ فلیٹ میں لے آیا تھا۔ وہ اس کی امید تھی۔ وہ بھلا اپنی امید سے کیسے ناامید ہوتا۔ تمام طبی سہولتیں مہیا کی۔ کشور چچی اور اماں کو آنے سے روکا۔ وہ آکر غلطی سے بھی ناامیدی کی باتیں کرتیں یا روتیں تو شاید یہ اچھا نہ ہوتا۔ زین کے خیال میں زارا کو دو چیزوں کی ضرورت تھی' اللہ کی نظر عنایت اور زین کی محبت۔ وہ اللہ سے دعائیں کرتا اور اس کی اپنی محبت تو تھی ہی زارا پہ نچھاور کرنے کے لیے۔ آج وہ امید کے ہاتھوں یہ یقین لے کر آیا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ وہ زارا کو مزید اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"زارا مجھ سے پوچھوگی نہیں؟ میں اتنے دن تک صفحے کالے کرکے کیا کرتا رہا ہوں؟" زین نے اس سے پوچھا۔

"ہماری داستان محبت لکھ رہا ہوں۔ تمہیں پتا ہے زارا میں نے اب اس سارے قصے کو چند لفظوں میں سمونا ہے' تاکہ اس کو کوئی پبلشر پڑھ کر چھاپ دے۔ پوری کتاب تو مجھ نکمے کی کسی نے نہیں پڑھنی۔ میں کبھی کبھی تمہیں یقین کی کہانی کہنا چاہتا ہوں۔ جانتی ہو میں نے یقین کو محسوس کیا' بالکل ویسے جیسے اس وقت تم نے میرا پیار محسوس کیا۔ بالکل ویسے جیسے تم نے تب میرا پیار محسوس کیا تھا جب میں نے بریسلٹ پہنایا تھا۔ جیسے تم نے اپنی کلائی پر مجھے محسوس کیا تھا' جب میں تمہارے گھر چوڑیاں پہنانے آیا تھا۔ میں نے بالکل اسی جذب سے یقین کو محسوس کیا اور پھر یقین میرے اندر سانس لینے لگا۔ مجھے حالات نے مارنے کی بہت کوشش کی' لیکن یہ یقین تھا جو میرے اندر سانس لیتا رہا اور میں لوٹ کر تمہارے سامنے کھڑا ہوا۔ زین اب اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں پہ بہت نرم بوسے دیے اور آہستگی سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو اس کی تھوڑی پہ چھوڑ کر پیچھے ہوا۔ پھر یقین نے مجھے معجزہ دکھایا۔ مجھے تم مل گئیں اور یوں ملیں جیسے مرنے والے کو زندگی ملتی ہے' لیکن میں غلط تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ تم مجھے ملیں۔ دیکھو اگلی ساری باتیں میرے دماغ سے محو ہوگئیں۔ بالکل ایسے جیسے میں تمہارے اوپر جھکا ہوا تھا اور تمہارے سے اگلا سانس نہیں لیا جارہا تھا۔ سچ کہہ رہا ہوں نا میں۔" زین اب ہنسا اور ہنستے ہوئے اس کے پیروں کی طرف آیا' وہ اس کے پاؤں پہ ناک رگڑ رہا تھا۔

"زارا حقیقت تو میں اور تم جانتے ہیں۔ میں کبھی تمہارے قابل تھا ہی نہیں۔ اماں نے صحیح کہا تھا۔ میں نظر بٹو ہوں۔ اس دنیا میں آیا۔ اپنے باپ کو کھا گیا۔ ماں کو رلا کر باہر گیا۔ واپس آیا۔ تمہیں لے کر یہاں آیا تو تمہیں اس حال میں پہنچادیا۔ آج جب تک تم معاف نہیں کروگی میں تمہارے پیروں سے اپنی ناک نہیں ہٹاؤں گا۔" وہ رو رہا تھا اور اس کے بڑے بڑے آنسو زارا کے پیر بھگو رہے تھے۔ پاؤں میں ہلکی سی جنبش ہوئی' زین نے نظرانداز کی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں رات کے چمکتے چاند پہ بدنما سیاہ داغ ہوں۔ میں ٹاٹ میں لگا پیوند ہوں۔ تم نے ہنسنا' بولنا اسی لیے چھوڑا کہ میں تمہاری زندگی سے چلا جاؤں۔ تم نے مجھے ٹھکرانے کی بہت کوشش کی' لیکن میں کمبل ہوا رہا۔ اگر آج تم نے مجھے معاف نہ کیا تو اللہ کی قسم میں رو' رو کر یہیں جان دے دوں گا۔"

"زین۔۔۔" زین کے رونے میں شدت آگئی۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نہیں تھی۔ حیرت کا سمندر تھا۔ واقعی آج اس کی سن لی جائے گی' اسے نہیں معلوم تھا۔ اس نے بمشکل اپنے اعصاب پہ قابو پایا۔ وہ آج آسانی سے پاگل ہوسکتا تھا۔ اس نے زارا کو نہیں دیکھا۔ اس کے پیر تھام کر وہیں رونے لگ گیا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا' جیسی اسپتال میں ماری تھیں۔ وہ شکر ادا کررہا تھا اور بہت ادا کررہا تھا۔ پھر وہ اس کے پیروں سے الگ ہوا اور سجدے میں جھک گیا۔

وہ یہی کرسکتا تھا۔ اسے یہی کرنا تھا۔ اللہ اسی کو دیتا ہے جو سر جھکاتا ہے۔ وہ واپس آیا اور زارا کا ہاتھ تھاما۔ زارا کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے لیٹی ہوئی زارا کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا تھا۔ اب اس کا اپنے' رونے سے اختیار مکمل ہٹ گیا تھا۔ وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اسے ترسنے کے بعد شکر کرنے کا موقع ملا تھا۔ کتنی ہی ساعتیں وہ روتا رہا' پھر اس نے اپنے بالوں میں کمزور سی انگلیاں چلتی محسوس کیں۔ وہ پرسکون ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا۔

"میں بکواس کررہا تھا۔" زین روتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"میں جانتی ہوں۔" زارا نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" زارا نے اظہار کیا۔

"میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ یہ لفظ "محبت" میرے جذبات کی ترجمانی نہیں کرسکتا۔" اس کے انداز میں بچوں کی سی ضد بولی۔

"لیکن ہم سے کوئی اور بھی تو محبت کرتا ہے۔" زارا نے اس کی تائید چاہی۔

زین نے زارا کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ جو کہنے والا تھا زارا جانتی تھی اور یہ زارا کا انداز بتا رہا تھا۔ اس کے پھیکے چہرے پہ یقین کی خوب صورت لہریں ابھرنے لگیں۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں محبت کی جلترنگ نے اپنی ساری دھنیں بکھیر دیں۔ وہ موت کے برحق ہونے اور زندگی کے اللہ کی رضا میں باقی رہنے پہ اعتبار کرچکی تھی۔ اسے زندہ رہنا تھا۔ اس کے لیے جس کے دل میں اللہ نے اس کی محبت ڈالی۔ اس محبت کے لیے جو اس کے اپنے دل میں بھی زین کے لیے موجود تھی۔ چیخ کر چلا کر رو کر کسی بھی طریقے سے وہ کسی حادثے کو بھلا نہیں سکتی تھی' لیکن سبق ضرور سیکھ سکتی تھی۔ اس آنے والے کل کی تیاری بھی کرسکتی تھی جس کے برپا ہونے کو ایک حادثے میں دیکھ کر آئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ سب سے زیادہ ہم سے اللہ محبت کرتا ہے۔" زین نے کہا تو زارا نے اس کے ہاتھ کو تھام کر اپنی آنکھوں پہ رکھ لیا۔ پھر دھیرے سے بولی۔ "واقعی اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرتے ہیں۔"

☼ ☼